شاہین و دراج
تصنیف
حضرت علامہ راشد الخیری
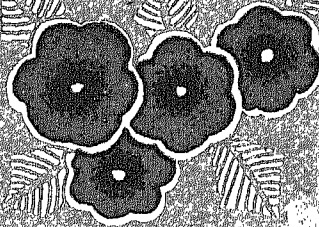
شاہین و دُرّاج

(مصورِ غم) علامہ راشد الخیری مرحوم

قیمت - بارہ آنے

ناشر:- عصمت بکڈپو لکھنؤ - پرنٹر:- سرفراز قومی پریس لکھنؤ
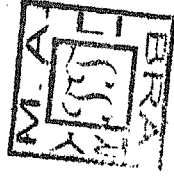
دُرّاج

خوشا نصیب سرزمین زابلستان! کیسے کیسے گوہر آبدار جن کی چمک سے تمام ایران جگمگا اُٹھا۔ آخرکار تیری گود میں آ لیٹے۔ خدا کی شان! وہ بیابان جن کے بگولے آسمان سے باتیں کرتے تھے۔ اُن باکمال لوگوں کی خواب گاہ بنے جو مرتے مر گئے۔ اور استقلال کو ہاتھ سے نہ دیا۔

زابلستان! تو مٹ چکا! تیری عمارتیں مسمار! تیرے محسن ڈھنڈار! تیری آبادی برباد! مگر کو لاکھ تاراج ہو جائے۔ تیری خاک میں وہ لاجواب ذرّے چھپے ہیں۔ جن کی آب و تاب آج بھی ویسی ہی ہے۔ جیسی تین سو برس پہلے تھی۔ تیرے کونے کھدرے تیرے پہاڑ اور کھنڈھانے ایسے خیالات کے خزانے ہیں۔ جن پر زمانہ مدت العمر ناز کرے گا۔ تیرے کھنڈروں میں وہ مٹی ہوئی صورتیں آرام کر رہی ہیں۔ جن کا نام صفحۂ روزگار سے مٹنے والا نہیں۔

یلغاری قبرستان! تیرے مہمان قیامت تک کروٹ نہ لیں۔ ان کی ہڈیاں گل جائیں۔ ان کی قبروں کے نشان تک مٹ جائیں۔ مگر سچی محبت کا سہرا اُن کے سر رہے گا۔ ان کے سچے اُصول ایسے شاداب پھول ہیں۔ کہ خزاں تمام دُنیا کو برباد کر دے۔ مگر یہ اُس وقت تک لہلہاتے رہیں گے۔ جب تک کارخانہ قدرت میں چشم بینا موجود ہے۔

کون کہہ سکتا تھا۔ کہ یہ بیچاری آتا تندھاری قوم سے یلغاری نسل سے تاتاری مفلس غریب خاتون کی ماری اس ناداری میں ایسا لعل بے بہا جن رہی ہے۔ جو ملکۂ شاہین کے گلے کا ہار ہوگا اور یہ مرزا درّاج دو ودوانوں کو محتاج سچی محبت کی ایسی لاج رکھے گا۔ کہ کیا طہران اور کیا اصفہان کیا آذربائیجان اور کیا مازندران تمام

ایران اس پر فخر کرے گا۔

تعجب ہوتا ہے۔ کہ وہ گھر اور نہ صرف گھر بلکہ خاندان جس کا بچہ بچہ منتفنی اور بے ایمان۔ اس میں ایک ایسا شخص پیدا ہو جو آسمان محبت پر چودھویں کا چاند ہو کر چمکے۔ اور عقل کام نہیں کرتی کہ ایسا وحشی جس نے کبھی آنکھ کھول کر تہذیب کو دیکھنا کیسا سُنا بھی نہیں خلق سے کوسوں دُور انسانیت سے محروم ایسا مظلوم بنے کہ شہر کا بچہ بچہ اس کے نام پر آنسو بہائے۔

شاہین و دُرّاج کے تعلقات عشق تھے۔ یا محبت، کم تھے۔ یا زیادہ، تھوڑے تھے یا بہت۔ اچھے بُرے۔ جائز ناجائز، صحیح غلط جو کچھ بھی تھے۔ اور جیسے بھی تھے اتنے ضرور تھے۔ کہ آج ایرانی منل اُس کی جانفشانی پر جس قدر فخر کریں نہایت درست اور بجا۔

یلغاری خاندان بُرا مانے تو مانا کرے۔ مگر ایمان کی بات یہ ہے۔ کہ ہم کو تو اُمید بھی نہیں کہ دُرّاج اس آن کا آدمی نکلے گا۔ کہ جان و ایمان سب کچھ قربان کر دے مگر اپنی شان کو ہاتھ سے نہ دے۔ ہم جانتے ہیں کہ دُرّاج جو مانگتا وہ ملتا اور جو چاہتا وہ لیتا۔ اس اخلاص اور عسرت میں بھی کہ کم بخت فاقوں پہ فاقے کرتا۔ اچھے اچھے صوبہ دار اُس کے آگے آنکھیں بچھاتے۔ خاص محلہ شنا در لو ر کے سرداروں کے گھروں میں سونے چاندی کے ڈھیر اور زر و جواہر کے انبار لگے رہتے۔ اُس فقیر کے اوپر سے بھر بھر جھولیاں نثار کرتے اور وہ اللہ کا بندہ آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتا۔ ان سب جھگڑوں کو جانے دو۔ کیسے رئیس اور کس کے سردار خود ملکہ شاہین اگر جھوٹوں اشارہ پاتی۔ تو سچ یہ دُرّاج جو کفن کو بھی محتاج مرا۔ ہیرے اور موتیوں سے مالا مال ہوتا۔ مگر صد آفریں آغا کے لال! برسوں میں پلا۔ سفاکوں میں بڑھا۔ ظالموں میں رہا۔ مگر وہ نام کر گیا۔ کہ جب تک

۵

چمنستانِ خیال میں محبت کے بار آور نہال موجود ہیں خلوص کے شیدائی تیری حسرت پہ رومیں گے صداقت کے دریا تیرے پاؤں میں لوٹیں گے۔ اور اے دُرّاج اگرچہ تو مر چکا مگر محبت کا وہ تاج تیرے سر پہ ہے جس کے جواہرات تمام عالم کو منور کر رہے ہیں۔
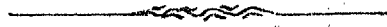
شاہین

شاہین والیٔ سلطنت تھی تو رعیت کو بھاگ اور حسن میں بے نظیر تھی تو میاں
دُرّاج کی خوش نصیبی۔ ہاں اتنا کہنے کا حق ہم کو بھی ہے کہ بلغاریوں پر ایسا زبردست
احسان کر گئی کہ جب تک اس خاندان کا ایک متنفس بھی زندہ ہے ہمیشہ مالامال
رہے گا بھیک مانگنے والے فقیر شاہین ہی کا دم تھا کہ پوتڑوں کے امیر بن گئے۔
بلغاریوں کا گروہ کتنا ہی بڑھ بڑھ کر بولے۔ مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ عمر
بھر تے کریں تو شاہین کا نمک اُن کی انتڑیوں سے نہیں نکل سکتا خود دُرّاج
کے آخری الفاظ جو اس راز کا انکشاف کر رہے ہیں صاف صاف بتاتے
ہیں کہ جیا تو شرمندۂ احسان جیا۔ اور مرا تو قربان ہو کر مرا۔

اس اقرار سے انکار نہیں کہ مرزا بدنصیب نے تکلیفیں بھگتیں، مصیبتیں جھیلیں۔
ظلم و ستم کی بوچھاڑ، رنج و الم کی بھرمار پے در پے صدمات لگاتار تکالیف و آفات
غرض جو کچھ ہونا تھا سب ہی کچھ ہوا۔ مگر بلغاری خاندان گریبان میں منہ ڈال کر
دیکھے۔ کجا ملکہ شاہین ایک عظیم الشان سلطنت کی مالک تین سرتاجوں کی سرتاج۔
کجا بیچارہ دُرّاج بیقرار صورت وحشیانہ مزاج! شاہین سی ملکہ اور دُرّاج کا جوگ
کجا نتھوا تیلی کہاں راجہ بھوگ!

ہم کو اس سفارش کی ضرورت تھی نہ ہے کہ شاہین کی غلط فہمی قابل معافی
ہے۔ ہاں جہاں دُرّاج کو بے قصور ثابت کرنا ہمارا کام ہے وہاں یہ کہہ دینا بھی
ضرور ہے کہ شاہین پر خواہش نفسانی کا الزام صریح بہتان ہے۔ خدا ترس
رحم دل۔ اپاہجوں کا سہارا، غریبوں کا گزارہ بیکسوں کی رفیق یتیموں کی شفیق۔

محتاجوں کی مددگار، مصیبت ماروں کی غمگسار، عیب کہو، نقص بتاؤ۔ اعتراض
کرو۔ کچھ ہی کہو، کچھ ہی کرو، صرف اتنا کہنا کہ جہاں بات کی سچی تھی۔ وہاں کانوں کی
کچی۔ مگر ہاں دُرّاج کے معاملے میں شروع سے آخر تک شاہین پر ایک حرف نہیں آسکتا۔
ابتدائی شفقتوں اور مہربانیوں کو دیکھو، خدا کی قدرت یاد آتی ہے۔ دُرّاج کو خواب
میں بھی یہ عزت نصیب ہوئی ہوگی۔ مگر اس بغلی گھونسے کا کیا علاج۔ جب موقع
اور رُخ دیکھا، ایسی ایسی جڑیں کہ بدگمان کر کے چھوڑا۔ جو لکھا تھا وہ پورا کیا۔ اور
جو کہا تھا وہ کر دکھایا۔ شاہین جو کچھ بھی تھی لونڈی نہ تھی۔ باندی نہ تھی۔ آخر تھی تو ملکہ
بدگمانی کے ملے ہوتے تھے۔ اوپر سے لگائی بجھائی عورت ذات۔ صفائی ہوئی نہیں۔
بات تھی کہ دل میں بیٹھ گئی۔ ایک نہیں پچاس واقعات ملکہ شاہین کے ایسے نکل گئے
کہ سینکڑوں کوس سے لوگ اس کے دربار میں روتے آئے اور ہنستے گئے۔ فریاد لیکر
آئے اور داد لے کر گئے۔ کس کو کلام ہو سکتا ہے۔ کہ اگر کہیں معاملہ کا اظہار ہو جائے
تو شاہین ملکہ تھی تو کیا، اس شان کی عورت تھی کہ دُرّاج کے پاؤں دھو دھو کر پیتی۔
مگر تقدیر کا لکھا کون ٹالتا اور کیوں ٹلتا۔ دُرّاج کا انجام جو ہونا تھا۔
وہ ہوا اور شاہین کی قسمت میں بدنام ہونا تھا وہ ہوئی۔ پھر بھی ہم اس راز کے
اختتام پر اتنا کہنے سے باز نہ رہیں گے کہ گو سینکڑوں برس گزر گئے۔ نہ ملکہ
رہی نہ دُرّاج۔ نہ ستم رہا نہ کرم۔ نہ وہ وقت رہا نہ بات۔ مگر اے خوبیوں بھری ملکہ
تو ہر الزام سے بری ہے۔ تیرا تاج شاہانہ محبت کے ایسے پھولوں سے آراستہ
ہے جو تمام دنیا کو معطر کر رہے ہیں۔

نوروز اور شاہین کی سواری

جشن کی تیاری یوں تو دنوں کیا مہینوں ہی سے ہو رہی تھی۔ مگر ماہ بہشت میں
تو ایران کا بچہ بچہ اسی ساز و سامان میں مصروف تھا۔ رعیت شاد شہر آباد
لوگ خوشحال دل خوشحال جو کچھ ہوتا وہ کم اور جو کچھ نہ ہوتا۔ وہ تھوڑا محل شاہی
کا تزک و احتشام سواری کی دھوم دھام پختہ سنگین سڑکیں۔ دھلی دھلائی بلور کی
طرح صاف شفاف دو کانوں پر بیلیں چڑھی ہوئی جھاڑ فانوس لگے ہوئے۔
زا بلستان تو آناً فاناً منہ سے بول اٹھا۔ سواری کا دن آیا تو صبح چار بجے سے ہزاروں
بندگان خدا گھر بار چھوڑ چھاڑ بازار میں آ کھڑے ہوئے عجیب پر لطف وقت اور
بہار کا سماں تھا کہ دور دور سے لوگ دیوانہ وار جوق در جوق چلے آتے تھے۔
طلوع آفتاب تک تو دکانیں اور بالاخانے مردوں اور عورتوں سے اٹ رہے
تھے۔ وہ گھڑی آخر آئی کہ ایک پہر ایک گرا پڑا اٹھا خدا خدا کر کے داخلہ سواری
کی طرف چلی۔ ہاتھیوں کی قطار زربفت کی جھولیں پڑی ہوئی سونے چاندی کی
عماریاں کسی ہوئی پیچھے فوج شاہی کا جلوس یہ سب کچھ ہو چکا تو سواری کی آمد آمد
ہوئی۔ اور چاروں طرف سے "ملکہ بلند اقبال" کی صدائیں شروع ہوئیں۔
شہزادی ایک مشکی گھوڑے پر سوار تھی پر نقاب خراماں خراماں رعیت کو جھکی
جھکی سلاموں کے جواب دیتی دلاتی چلی آتی تھی۔ خوشی کا وقت جشن کا روز کامیابی کی
توقع انصاف کا یقین سینکڑوں اللہ کے بندے اپنی اپنی حالت زار کا اظہار کر رہے
تھے محتاج صدقات سے مالا مال مظلوم داد رسی سے نہال ایسی اچھی گھڑی
تھی کہ بڑے سے چھوٹے تک جس کے چہرے پر نظر پڑتی تھی ہشاش بشاش دکھائی دیتا تھا۔

محافظین کا گھیرا وہ ہاتھ میں ننگی تلواریں کمر میں ایرانی خنجر دائیں بائیں آگے پیچھے ترقی
دولت و درازی عمر کے نعرے مار رہا تھا۔ دفعتاً ایک طرف سے بندوق کی آواز
جس نے نہ صرف ملکہ اور فوج شاہی بلکہ تاتاری اور ایرانی شہری اور سیلانی سب
کے کان کھڑے کر دیئے۔ ترہی نے اندیشہ کا بگل بجایا اور محافظین کا دستہ سمٹ سمٹا کر
ایک جگہ جمع ہو گیا۔ ادھر شہزادی ششدر و حیران اُدھر فوج شاہی سراسیمہ و
پریشان۔ ابھی اطمینان نہ ہوا تھا کہ دوسری گولی شاہین کے پاس سے سائیں سائیں
کرتی ہوئی نکل گئی، جادو کا سا کارخانہ تھا۔ چاروں طرف لوگ آنکھیں پھاڑ
پھاڑ کر دیکھتے تھے۔ مگر خاک پتہ نہ چلتا تھا کہ یہ واردات ہے کیا۔ بڑے بڑے
بہادر اور اچھے جری دنگ کھڑے تھے کہ یہ آفت ناگہانی زمینی ہے یا آسمانی۔

شیر افگن خاں جیسے سپہ سالار کی دلیری اور مرزا شجاع جیسے جری کی شجاعت
دھری کی دھری رہ گئی۔ اور تیسری گولی نے عربی النسل گھوڑے شمس افروز کو جو
جشن نوروز کے واسطے مخصوص تھا ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔

دشمن تو اپنا کام کر ہی چکا تھا اور سچ پوچھو تو شاہین کی موت میں کوئی کسر نہ رہی
تھی۔ مگر کچھ تقدیر ہی کی زبردستی تھی کہ سپہ سالار کی نظر اتفاق سے فصیل پر جا
پڑی۔ دیکھا تو ایک شخص کنگورے کی آڑ میں بیٹھا توڑا سلگا رہا ہے۔ اب کیا تھا
سیکڑوں دوڑ پڑے۔ مگر وہ شقی القلب کیا چوکنے والا تھا جب تک گرفتار ہو۔
ملکہ کی شست باندھ دست بخیر ایک فیر اور کیا۔ ایسے خطرناک وقت میں یلغاری
خاندان کی وفاداری قابل داد تھی۔ نمک خوار اور جاں نثار ملازم اور وفادار
سب ہی موجود تھے۔ مگر ایک کی ہمت نہ پڑی کہ حق نمک ادا کر جاتا۔ یہ مخبر تھا گوکلراج
کی تقدیر میں۔ محافظین میں شریک نہ فوج میں شامل۔ سپاہیوں میں بھرتی نہ اردلی
میں داخل۔ سب ساتھیوں کو چھوڑ چھاڑ آگے بڑھا اور ملکہ کو آڑ میں لے نزدیک آکھڑا

ہوا۔ یہ مرزا کی خوش نصیبی تھی کہ گولی خالی گئی۔ قریبی رشتہ دار اور پشت در پشت کے نمک خوار کھڑے کے کھڑے رہے اور قاضی پور کا وحشی سب سے بازی لے گیا۔

ملکہ شاہین کی حکمرانی کے عہد سے ایرانیوں میں یہ نئی رسم ایجاد ہوئی تھی کہ جشن نوروز دریائے ماہون میں منایا جاتا تھا۔

سلطنت کے معزز اہلکار کرسی نشین اہل دربار خاندان شاہی کے رشتہ دار سال بھر تک اپنی اپنی کشتیاں تیار کرتے تھے۔ آبنوس و شیشم کے تختے زمرد و جواہر کی پچی کاری زنگار رنگ کے پردے انواع و اقسام کی گلکاری نیچے رومی و کاشانی مخمل اور ایرانی اور زابلستانی قالین۔ جواہر نگار کرسیاں پھولوں کے ہار پڑے ہوئے غرض کچھ ایسے تکلفات ہوتے تھے کہ رفتار دربار میں بھی ایک انداز محبوبانہ پیدا ہو جاتا تھا۔

باغی گرفتار ہو کر سر بازار سولی دیا گیا۔ خیر خواہان سلطنت رستے بھر روپے اشرفیاں لٹاتے رہے۔ اور سواری شاہین شہر سے ہوتی ہوئی کنارۂ دریا پر پہنچی دستہ تاتاری نے سلامی دی۔ بندوقوں کی گرج سے تمام میدان دھواں دھار ہو گیا۔

ظاہر ہے کہ یہ صرف ملکہ شاہین کا اقبال تھا کہ بال بال بچی۔ مگر بجائے اس کے کہ وہ نہال نہال ہوتی بالکل افسردہ تھی۔ چپ چاپ چلی اور گم سم آئی۔ اتری تو مغموم کھڑی ہوئی تو افسردہ بیٹھی تو محزون اور لیٹی تو مردہ۔

شاہین کی خاموشی نے ساری خوشی مٹی کر دی۔ اور دریائی جشن پر بالکل پانی پھیر دیا۔ رعیت کے ارمان دل کے دل ہی میں رہے۔ ندیمیں تو درکنار کسی کی اتنی جرات بھی نہ ہوئی کہ بات تک کر لیتا۔ طواف تیموری کی رسم جو پرانی تھی اور شاندار تھی اور یونانی کے زمانہ سے چلی آتی تھی ضروری سمجھی گئی اور مجبوراً ادا کرنی پڑی۔

طواف تیموری سلطان علاؤالدین کا زوال اور رابعہ اول کی چوٹی کا [illegible]

تھا جس کے گرد طواف کرنے کے بعد والئی سلطنت تخت زابلستان کی ترقی کے لئے دُعا کرتا تھا گنتی کے دو چار آدمی جو خاندان شاہی سے خاص تعلق رکھتے تھے۔ اسی رسم کے ادا کرنے میں شریک ہوتے تھے۔ اور اختتام دعا پر اُمراء وزراء معہ فوج شاہی آمین پُکارتے تھے۔

ملکہ کی افسردگی نے وہ تمام سماں درہم برہم کر دیا۔ البتہ مراحم خسروانہ یا جان بچانے کا احسان جو کچھ تھا۔ اتنا ضرور ہوا کہ مرزا اُدّراج کو اس رسم میں شریک ہونے کی اجازت دی گئی۔ شاہین کی افسردگی اور اضمحلال لمحہ بہ لمحہ ترقی کرتا جاتا تھا۔ طواف تیموری پہلے ہی سے آراستہ و پیراستہ تھا۔ بادل ناخواستہ گئی طواف کیا اور برائے نام دُعا مانگ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ارکین شاہی سلام کے منتظر تھے چھت پر آئی اور تمام فوج کو رخصت کیا۔

محافظین کا ایک مخصوص دستہ تیار و کربستہ کنارہ دریا پر موجود رہا۔ کام کاج کے لونڈی غلام اور مرزا اُدّراج کشتی کے زیریں حصے میں تھے اور شاہین چھت پر لہروں پر نظر ڈال کر خدا معلوم کس خیال میں غرق ہوئی۔ سر دن ڈھل گیا اور وہ اپنی جگہ سے نہ سرکی کس کی مجال تھی کہ دم مارتا۔ کیسا قہر غریب اُدّراج پر ہنسی آتی ہے۔ اچھی جان بچائی۔ سر دن بھر بھوکے مرے۔ کنارے کی فوج اُسی طرح بندھی سو گئی۔ ملکہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

بسا غنیمت تھا کہ ابر غلیظ چھایا رہا۔ ورنہ زابلستان کی گرمی الامان الحفیظ! آخر آسمان نے طوطے کی طرح دیدے بدلے اور چلچلاتی ہوئی دھوپ نے چھکے چھڑا دیئے۔ دوپہر کا سنسان وقت راہوں کا سناٹا اتنے بڑے دریا میں لے دے کر ایک کشتی اُس میں بھی گنتی کے چند آدمی۔ وہ بھی اول تو لونڈی غلام اور کچھ سپاہی غرض ایک ہو کا میدان تھا۔ چاہیئے کہ شاہی محلوں کی بیٹھنے والی عورتوں کا سر سنے

والی زود رنج ۔ عالی دماغ ۔ مشاور بے الغضب ۔ نازک مزاج ۔ آفتاب کے اس پیچ و
تاب سے گھبرا جاتی ۔ لیکن غضب کی دھوپ کو جیلی ۔ انڈا چھوڑے سب اس
کے سر پڑ گئی ۔ ناں بہشت کا سہانا سا دن صاف گذر گیا ۔ اور کیا مجال جو اس کے منہ
تک اڑ کے دانہ گیا ہو ۔ سورج اپنی گرمیاں دکھا دکھا کر رخصت کے قریب پہنچا ۔ اور
آسمان نے ایک دوسری کروٹ لی ۔ اب جھٹ پٹا وقت تھا ۔ بھوکوں کی آہ رنگ
لائی ۔ رنگ بہ رنگ بدلیاں ابر سیاہ سے گھر اور کالی گھٹا نے اندھیرا گھپ کر دیا ۔ ہوا سرسرا کے
سے جھونکے اور جھونکوں سے جھکڑ بنی ۔ پانی جو تھوڑی دیر پہلے مستانہ وار اترا اتھا کہ
بھر اچھا اگر دوں اوپر اچھلنے لگا ۔ دونوں ملاح ہوا کا یہ رنگ دیکھ کر دنگ رہ گئے ۔
مگر کس کی مجال تھی کہ دم مار سکتا ۔ کشتی سفری تھی کشتی بیکی بھالی وہ بھی جھونکوں میں کہیں
پہنچی ۔ یہ سب کچھ ہوا ۔ ملکہ بھی انڈے کی بندی اپنی جگہ سے نہ سرکنا تھی اور نہ سرکی ۔
کسی اور کی ہمت تو پڑی نہیں ۔ ایک بیچارہ دراج ہی دکھائی دیا ۔ کہ اس نے آندھی میں
آکر جان بچائی ۔ اسی غریب کو اللہ پر رکھ کر ملکہ کی خدمت میں روانہ کیا ۔

دراج ایک اکھڑ گنوار تہذیب سے آشنا نہ آداب شاہانہ سے خبردار ۔ اس
کو آپ اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے ۔ وہ یقین کر چکا تھا کہ میں لاکھ تیراک
مگر اس طوفان میں خاک پیش نہ جائے گی ۔ مرتا کیا نہ کرتا ۔ دل کڑا کیا ۔ اور اوپر پہنچا
شاہین ہمارا جانے سلطنت کے ایسے کوئل سے اہم معاملات پر غور کر رہی تھی ۔ اور
کیا الجھنیں سلجھا رہی تھی ۔ کہ دراج کے پاؤں کھڑے کھڑے شل بھی ہو گئے ۔ اور
ملکہ نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا ۔ دراج بدنصیب عجیب مصیبت میں پھنسا ہوا تھا ۔
بھوک کے مارے جان نکل رہی تھی ۔ طوفان کے مارے ہوش اڑے جاتے تھے ۔
سوچتا تھا اگر آج اچھے کسی نجومی کا منہ دیکھ کر اٹھا کہ روٹی کا ٹکڑا آ تو درکنار جان
بچی تو بالی جان ہو گئی ۔ بہتیرا آمادہ ہوتا تھا ۔ اور ہر چند ارادہ کرتا تھا ۔ کہ آگے

بڑھوں اور کچھ کہوں۔ مگر کچھ ایسا رعب چھایا۔ کہ ایک قدم آگے نہ اٹھا۔ ہوا لمحہ
لمحہ تیز ہو رہی تھی۔ اور پانی گز دو گز چھوڑ بلیوں اچھل رہا تھا۔ کالی گھٹا خالی نہ گئی
اور موسلا دھار پانی پڑنا شروع ہوا۔ خدا کا شکر ہے کہ اسی بہانے سے ملکہ کا
سلسلۂ خیالات برہم ہوا۔ گھبرا کر اٹھی اور رسٹ پٹا کر پیچھے چلی۔ کشتی پہلے ہی سے
ڈگمگا رہی تھی۔ دائیں طرف جھکنا تھا کہ پاؤں پھسلا اور دھڑام سے دریا میں۔ دراج
شناور یورکا رہنے والا اگرچہ دنیا میں کوئی فن جانتا تھا تو تیراکی۔ فوراً کودا۔ ملکہ کو پشت
پر لیا اور بحفاظت تمام کشتی میں لے آیا۔ سب اپنے اپنے کونوں میں بھوکے پیاسے
دبکے سکڑے بیٹھے تھے۔ اتنے بڑے واقعہ کی کسی کو کانوں کان بھی خبر نہ ہوئی

ہاں جان بچانے کے یہ دو ایسے زبردست احسان شاہین کی گردن پر ہوئے۔ کہ
ہمیشہ کے واسطے ممنون ہو گئی۔ پوشاک تبدیل کی۔ کنارے پر آئی تو دراج کو
اپنے ساتھ ہوا سیہ گاڑی پر بٹھایا اور اس طرح باتیں کرنے لگی:۔

شاہین: تم نے دو دفعہ میری جان بچائی۔ تم کون ہو اور کہاں رہتے ہو؟"

دراج: میں یہیں رہتا ہوں میرا گھر قریب ہے۔ اجازت ہو تو جاؤں۔"

شاہین: تو تم میرے ہمراہ محل تک نہیں چل سکتے؟"

دراج: میری سب سے چھوٹی بچی جس کی ماں تیرہ روز کا چھوڑ کر مری اور اب ڈیڑھ برس کی ہے۔ مجھ سے بہت مانوس ہے۔ اس نے اتنی ہی دیر میں رو رو کر خون کیا ہوگا۔ حکم ہو تو میں کل حاضر ہوں۔"

شاہین: تم نے ایک چھوڑ دو دفعہ اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر میری جان بچائی۔ یہ ایسا احسان ہے کہ میں اس کا معاوضہ نہیں کر سکتی۔ بالفعل یہ انگوٹھی قبول کرو۔ اور صبح کو دربار میں حاضر ہو۔"

دراج: میں نے جو کچھ کیا وہ ہرگز احسان نہیں ہے۔ اور نہ اس غرض سے

کیا کہ شہزادی کی جان بچا کر مالا مال ہو جاؤں۔ اس کا معاوضہ صرف اتنا چاہیے کہ میں جب سلام کو حاضر ہوں تو باریاب ہونے کی اجازت مل جایا کرے۔

شاہین "صرف باریابی سے تمہارا پیٹ نہیں بھر سکتا۔ تم نے ایسا کام کیا ہے کہ جب تک سلطنت زابلستان موجود ہے۔ تمہارا نام باقی رہے گا۔ تمہارے تعلقات خاندان شاہی کے ساتھ ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ تخت زابلستان تمہاری وفاداری پر فخر کرے گا۔ سلطنت تمہارا وظیفہ مقرر کرے گی۔

دُرّاج "میں ہرگز اس کا بھوکا نہیں ہوں مجھ کو صرف اتنی اجازت ملے کہ جب حاضر ہوں شرف ملاقات ہو جایا کرے۔ یہ سب سے بڑا احسان ہے۔

شاہین "میری سمجھ میں نہیں آتا اس سے تمہارا کیا مطلب ہے۔ تم شوق سے آؤ۔ اور جب دل چاہے آؤ۔ لیکن اس انگوٹھی کو منظور کرو۔ جو میں ہاتھ سے تمہاری انگلی میں نہایت خلوص کے ساتھ پہناتی ہوں"

دُرّاج "اس کی قیمت میری نگاہ میں اس لحاظ سے ہوگی۔ کہ یہ آپ نے بطور مراحم خسروانہ مجھ کو عطا فرمائی"

اللہ اللہ شبستان انسانی کا خوشنما منظر آنکھ کے سامنے ہے۔ تاروں بھری رات سر پر ہے اور ماہ کامل نے در و دیوار منور کر رکھے ہیں حسینان گل اندام شراب ناب ساغر بلوریں قدرت نے تمام سامان مہیا کر دیئے اے دل و جان سے زیادہ پیارے دوست کہاں ہو۔ تمہاری صورت دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں۔ آؤ۔ آؤ تھوڑی دیر مل بیٹھو۔ ادھر آنکھ اٹھا کر دیکھو۔ یہ ہزار ہا بندگان خدا اپنی تمناؤں کو آغوش میں لیے کیسی میٹھی نیند سو رہے ہیں ان کے پختہ سنگین مزارات کی ٹوٹی پھوٹی قبریں اپنے مٹنے والوں پر حسرت کے آنسو بہا رہی ہیں۔ اور ہوا کے خوشگوار جھونکے ان مٹی کے ڈھیروں پر جھاڑو دے رہے ہیں۔ اے جیتے جاگتے پیارو! زندہ عزیزو۔ دیکھو وقت فرصت اور بسا غنیمت ہے تغیرات کی

بوجھا اُڑ جانے کے ساتھ ہے۔ روؤگے اور پچھتاؤگے۔ مگر یہ وقت نہ پاؤگے۔ دیکھو چاند مدھم ہوا۔ چاندنی پھیکی پڑی۔ تارے جھلملا گئے۔ ساغر بلوریں ٹوٹ گئے۔ اور وہ حسن کی دیبیاں چھوٹ گئیں۔ قافلہ والوں نے اپنا اپنا رستہ لیا۔ اور بلبل خوش الحان صبح کا پیغام لے آئی۔ آہ کیسی اچھی رات تھی۔ مگر بات کرنے میں ختم ہوگئی۔ اور دیکھتے دیکھتے وہ سماں درہم برہم ہوگیا۔

اے آبادی کو چھوڑ کر جنگل بسانے والو! اے نونہالو اور پری جمالو! سوؤ، سوؤ، پیٹ بھر کر سوؤ، خوش نصیب تھے۔ تم کو انقلابات کے چکر سے چھوٹے! گھر برباد کیے۔ اور یہ بستی آباد کی!

دنیائے ناپائدار کے دام تزویر میں پھنسنے والو! تجسس کی آنکھیں کھولو اور تماشاگاہ عالم کی نیرنگیوں پر نظر ڈالو! زمانہ اُڑا چلا جا رہا ہے۔ اور عمریں ختم ہو رہی ہیں۔ غنیمت ہے وہ وقت جو اطمینان سے گزر گیا۔ کشتی عمر معمولی رفتار سے بہہ رہی ہے اور انقلاب کی لہریں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔

کیسا مبارک وقت ہے۔ ملکہ شاہین اپنی چھنگلی سے انگوٹھی اُتار کر دُرّاج کی انگلی میں پہنا رہی ہے۔ دُرّاج حسرت آمیز نظر سے شاہین کے چہرے کو دیکھ رہا ہے۔ انگوٹھی پہن چکا۔ تو کھڑا ہوا اور کہنے لگا۔

"ملکہ! کس منہ سے شکریہ ادا کروں"

ملکہ "اب تم جاؤ۔ صبح کو دربر دولت پہ حاضر ہونا۔"

گاڑی ٹھہری دُرّاج اُترا اور سلام کر کے رخصت ہوا۔

دربار شاہین

دُرّاج کی دوسری جان نثاری کا علم شاہین تک محدود رہا مگر پہلا معرکہ تو ایسا علی الاعلان تھا کہ ایران کا بچہ بچہ اُس کی شجاعت کا لوہا مان گیا۔ یہ بڑے بڑے نمکخوار اور بڑے بڑے پہلوان سب دھرے کے دھرے ہی رہے اور ایک سے اتنا نہ ہوا کہ وقت پر کام آتا۔ شاہین لاکھ بری آدمی سہی مگر احسان فراموش نہ تھی۔ سوچتی تھی کہ اگر زر و جواہر سے بھی تول دوں۔ تو اس کے احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ آدھی رات تک اسی چکر میں پڑی رہی سینکڑوں تدبیریں اور ہزاروں منصوبے سوچ ڈالے جس عورت نے کبھی ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دی ہو اُس پر ایک چھوکرے کا دوہرا احسان اور وہ بھی ایسے زبردست اس پر طرہ یہ کہ پالا پڑا تو ایسے شخص سے جو دل کا غنی نیت کا سیر ہاتھ کا سچا بات کا پکا صورت خوبصورت سیرت کا وفادار غرض شادی سے کوسوں دور وضع داری میں چکنا چور چھٹا ہوا ہو تو کیونکر! کہتی تھی کہ عجیب قسم کا آدمی ہے۔ وظیفے کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھر گیا۔ روپیہ سے بیزار۔ انگوٹھی سے انکار۔ بیٹھنے سے وحشت ساتھ چلنے سے نفرت۔ ایسے شخص کا احسان تقدیر میں لکھا تھا۔ دیکھا نہ سُنا بھوکا ہوتا پیٹ بھرتی ننگا ہوتا بدن ڈھانکتی۔ مال و دولت کا طالب ہوتا تو بھر سے امیر کرتی۔ جاہ و حشمت کا طالب گار ہوتا تو زیر سلطنت بناتی۔ یہ کیسا ستم ہے؟ ہے سب کچھ۔ چاہتا کچھ نہیں۔ دل کو کس کو اور کیسے دلاؤں کیا! آدمی کیا فرشتہ ہے۔ واسطہ نہ غرض۔ جان نہ پہچان۔ خدا واسطے جان پر کھیل گیا۔ سینکڑوں ہی انسان دیکھے اور سُنے ہوتے اور ہوں گے۔ مگر ایسا شخص تو وہم اور گمان میں بھی نہ تھا۔ کچھ نہ ہونے پر تو یہ کچھ ہے کچھ ہوتا تو کیا کچھ ہوتا۔ یہ برسوں بلکہ قرنوں کے نمکخوار جن کو جان نثاری کے بڑے بڑے دعوے

تھے عمر بھر مفت کی روٹیاں توڑیں اور ایک بھی کام کا نہ نکلا سب نمک حرام اور
ایک سے ایک بدتر۔ عقل کام نہیں کرتی۔ کیا کر دوں کیا نہ کر دوں؟ مگر اس میں کلام نہیں
مال و دولت کیا اگر سلطنت بھی بخش دوں اور وظیفہ و خلعت کیا اگر ریاست و حکومت
بھی منظور کر لے تو احسان کا معاوضہ تو ہوتا نہیں۔

رات کا بڑا حصہ اسی ادھیڑبن میں گزرا۔ اور علی الصباح شہباز خاں وزیر اعظم
حکم شاہی ہاتھ میں جو اسپہ گاڑی ساتھ میں دُرّاج کے دروازے پر حاضر ہوا۔
دُرّاج غریب اس گھڑی کو نہ پاتا تھا جب جشن دیکھنے کا ارادہ کیا۔ شاہین کے
الطاف خسروانہ رسم تمیوری میں ساتھ لے جانا۔ گاڑی میں پاس بٹھانا۔ یہ وہی وار
ایسے کاری تھے جن کی تلافی اس کے بس کی نہ تھی۔ اس پر انگوٹھی کا نشتر ایسا کاری زخم
لگا جس نے ساری شیخی کرکری کر دی۔

دُرّاج سا سادہ لوح اور ہاتھ ملانے کا زبردست جبر کا جب تک ملک آنکھ کے
سامنے رہی بہت کچھ سنبھلا رہا۔ مگر اوجھل ہونا تھا۔ کہ وہ سفاکی اور بیباکی سب
رخصت ہوئی۔ گاڑی سے اترا تو دل کا نشہ ہی مالک تھا۔ بھوک پیاس گئی گزری۔
کسل و تکان ندارد ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ چشم زدن میں وہ سہارا بھی گیا۔ اور
گاڑی آناً فاناً یہ جا وہ جا۔ حسین عورت شباب کا زمانہ۔ کانوں میں الماس گلے میں
مالا۔ صورت کی افضل سیرت کی اعلیٰ۔ ہاتھوں میں ہیرے پاؤں میں لعل محبوبانہ انداز
مستانہ چال حُسن میں مست جوانی میں چُور۔ دُرّاج کو تو شاہین سچ مچ کی حور لگی۔
دل تو صورت دیکھتے ہی نذر ہو چکا تھا۔ رہے سہے ہوش حواس انگوٹھی کی بھینٹ
چڑھے کیسا کھانا دانہ اور کیسی بھوک پیاس شاہین کے پاس سے اٹھا تھا کہ کلیجہ منہ
کو آنے لگا گھر کی طرف مڑا تو دل کی حالت ہی کچھ اور تھی۔ قدم رکھتا کہیں تھا پڑتا کہیں
منہ سے کہتا کچھ تھا نکلتا کچھ۔ خدا خدا کر کے گھر پہنچا تو لڑکی نے ایک آفت مچا رکھی تھی۔

بن ماں کی بچی ۔ ڈیڑھ برس کی جان ۔ مگر اُس اتنی سی فتنی نے گھر بھر کو ہلکان کر دیا ۔ دن کے دس بجے سے جو چلّانا شروع کیا تو پھر گھڑی رات کی تو پ چل گئی اور اُس کی چیخم دھاڑ نہ تھمی ۔ جھولے میں لٹا کر جھوٹے دیئے ۔ گود میں لٹا کر لوری دی ۔ مگر کیا مجال جو ذرا تالو سے زبان لگی ہو ۔ جس دن سے ماں مری کھانا پینا اُٹھنا بیٹھنا جو کچھ تھا ۔ باپ کے ساتھ اور باپ کے ہاتھ ۔ ماں تھی تو وہ اور باپ تھا تو وہ ۔ کیسی ہی بلکتی ہو جہاں گود میں لیا اور کندھے لگا کر ٹہلا جھٹ نیند آئی ۔ پوری طرح پاؤں پاؤں بھی تو نہ چل سکتی تھی ۔ مگر دم بھر کو بھی ذرا ادھر اُدھر ہوتا تو وہ گھسٹتی گھسٹاتی لڑھکتی ٹھڑکتی ڈیوڑھی میں جا بیٹھتی اور بابا کہہ کر پکارتی ۔ اُس کی آواز سُنی اور تالیاں بجا بجا کر نہال ہوئی ۔ آج بھی کچھ دیر تک تو بابا بابا کہہ کر خوب تماشا کرتی رہی ۔ اور پھر تو آخر دراج ہی کی بیٹی تھی ۔ مزاج تھا کہ گھڑی تولہ اور گھڑی ماشہ ۔

آغا تندرھاری بیچاری پہلے ہی اپنی بیماری میں گرفتار تھی ۔ ذرا سی کی آواز نکلی اور اُس کے کان سے پار ہوئی ۔ پوتی کا بلکنا اور مرے کو مارے شاہ مدار ۔ مگر کیا کرتی اور کہاں جاتی ۔ دن بھر گود میں لیے ٹہلتی رہی ۔ خدا جھوٹ نہ بلائے تو سینکڑوں ہی پھیرے دروازے کے کر ڈالے ہوں گے ۔ دالان انگنائی ایک کر دیا ۔ مگر وہ چنچل ہی قابو میں نہ آئی ۔ دراج غریب کی خود جان پر بنی ہوئی تھی ۔ کس کی ماں اور کیسی بیٹی ۔ کہیں آدھی رات کے قریب گرتا پڑتا گھر پہونچا تو ادھر سے ماں بھبک کر آئی اُدھر سے بہن نے ٹانگ لی ۔ لڑکی کی یا تو یہ کیفیت تھی کہ گھر بھر کو پریشان کر رکھا تھا ۔ باپ کی آواز سنتے ہی جان آ گئی ۔ مرزا کی حالت دیکھنے کے قابل تھی ۔ چاروں طرف سے پوچھا ڑ ہو رہی تھی اور گم سُم کھڑا تھا ۔ ماں کے جیسیوں کوسنے بہن کی سینکڑوں باتیں اُس کان سُنیں اور اس کان اُڑا دیں ۔ اتنی بھی خبر نہ ہوئی کہ ماں بیٹیاں کہہ کس کو رہی ہیں ۔ لڑکی کو لیے چبوترے پر ٹہلنے لگا ۔ گود میں لڑکی خیال میں شاہین ۔ لب پر دُعا اور دل میں آہیں !۔

بھڑاس نکل چکی تو ماں نے کھانا نکالا بہن نے پانی کی صراحی بھری اور بھائی کے پاس لاکر رکھی۔ بچی دن بھر کی تھکی ہاری سولہ سترہ گھنٹے کی چھوٹی پہلے تو خوب پھوٹ پھوٹ کر روئی اور پھر اُدھر باپ کی گود اور پرسے ملی لوری کندھے پر سر رکھتے ہی چٹ ہوگئی۔ الگ سے لٹا دسترخوان پر آیا جوان آدمی ہٹا کٹا موٹا تازہ سیر آدھ سیر کچھ تو کھاتا۔ پہلا ہی نوالہ گولی بن کر رہ گیا۔ شاہین کی صورت دل میں ایسی کھبی کہ کھانا پینا سب بھلا دیا۔ سوچتا تھا اور ٹھیک سوچتا تھا کہ شاہین جیسی ملکہ اور میں۔ زربفت کو گاڑھا مخمل کو ٹاٹ جنم نہ دیکھا بورِیا سپنے میں آئی کھاٹ کیسی حوریں اور کس کے غلمان بس شاہین کے آگے اللہ کا نام ہے۔ ہاتھ پاؤں۔ آنکھ۔ ناک جو عضو ہے سانچے میں ڈھلا کانٹے میں تلا صورت سیرت وضع قطع ایک سے ایک بہتر ایک سے ایک اعلیٰ کس سے کہوں اور کیا کہوں۔ جو سُنے گا وہ پاگل بنائے گا۔ اس کے اونٹے غلام بھی تو مجھ سے اچھے ہوں گے۔ اچھی جان بچائی کہ اپنی ہی جان اجیرن ہوگئی کہیں جلد صبح ہو۔ بلا سے اور کچھ نہیں تو دور سے دیکھ تو لوں گا۔

دسترخوان پر بیٹھا خیالی پلاؤ پکاتا رہا ماں بہنوں کو اس دلو ٹری کے پھیر کی کیا خبر۔ وہ دولو سکھی کی پڑکر ڈھیر ہوئیں۔ اُٹھا کھانا جوں کا توں چھینکے پر رکھ کر پلنگ پر آیا تو آنکھیں پتھرا گئیں۔ پلک سے پلک جھپکانی حرام ہوگئی۔

تماشا گاہ قدرت کے مبصر چشم تامل سے دیکھ رہے ہیں کہ جسد فانی کا عنصر خاکی قالب انسانی کے سانچے میں ڈھلا رنگ برنگ کے جلوے دکھا رہا ہے۔ زندگی کا چمن شاداب پیش نظر ہے۔ وسط چمن میں ایک خوشنما قطعہ ہے جس کے چاروں طرف یقین کامل کی مصفا نہریں لہریں لے رہی ہے۔ اُمید کے خوش رنگ پھول کھل رہے ہیں۔ زمین گلہائے رنگین کی بچھاوٹ سے حسین عروس بن چکی ہے۔ باد مراد کے جھونکے چل رہے ہیں اور بادِ آوارہ ڈالیاں جھوم جھوم کر پانی کا منہ چوم رہی ہیں۔ طائران

ر نوا سنج لہک لہک کر چہک رہے ہیں۔ اور گل امید کی پنکھڑیوں پر پروانہ وار نثار ہو رہے ہیں۔

سبزۂ خوابیدہ پر یاس و ناامیدی کا جال پھیلا ہوا ہے اور انقلاب زمانہ کا صیاد تاک لگائے بیٹھا ہے۔ مگر یہ بھولی بھالی صورتیں نشۂ محبت میں چور ہشاش بشاش کلیلیں کرتی پھر رہی ہیں اپر تول تول کر پھولوں پر گر رہی ہیں اور پانی میں ڈبکیاں لگا لگا کر پھُر پھُر اڑ رہی ہیں۔

مایوسی کے پھندے صاف نظر آ رہے ہیں۔ مگر امید کے بندے ایسے اندھے ہیں کہ کچھ سجھائی نہیں دیتا۔

آخر فلک کج رفتار نے صبح صادق کو زوال بنایا۔ اور رفتہ رفتہ آفتاب جہاں تاب نے بسیرے کی ٹھہرائی کیٹھرلے سے پھول جن کی مہکار کوسوں دور جا رہی تھی کہیں سے کہیں پہونچے۔

اب وہ تمام سماں درہم برہم ہوا قطعۂ امید کانٹوں سے پٹا پڑا تھا جس پانی میں رنگ برنگ کی مچھلیاں تیرتی پھرتی تھیں خشک ہو چکا تھا کہیں کیچڑ کے ڈھیر تھے۔ کہیں دل دل کے انبار جن کی نوا سنجیاں کچھوؤں کے یاد ہو رہی تھیں۔ جال میں پھڑپھڑا رہے تھے اور حسرت ندامت سے سر دے دے پٹکتے تھے۔

رات کو گرفتار کو نیند تو کیا خاک آتی لاکھ بن سنور کر لیٹا ہزار کروٹیں بدلیں بہتیرا چاہا ہر چند کوشش کی۔ مگر شاہین کا خیال ایسا ہاتھ دھو کر پیچھے پڑا کہ کسی عنوان تسکین نہ ہوتی تھی کبھی گل امید کی خوشنما پنکھڑیاں دل و دماغ کو معطر کر دیتی تھیں۔ اور کبھی یاس و ناامیدی زندگی سے بیزار کر دیتی تھی۔ لیٹا، بیٹھا۔ اٹھا، پھرا۔ زینہ کھول اوپر گیا۔ دروازہ کھول باہر آیا چھت پر بیٹھ کر تارے گنے کمرے میں بیٹھ کر گھڑیاں گنیں۔ تڑپا لوٹا چیخا پیٹا اسے سمجھایا جا کر مؤذن کو جھانکا کھڑا نیچے میں آ کر

مُرغ کو گھورا جو نہ کرنا تھا وہ کیا اور جو نہ کیا تھا وہ کر ڈالا۔ مگر صبح نہ ہونی تھی اور نہ ہوئی۔
دل میں کہتا تھا کہ اگر کہیں ملکہ جھوٹوں اشارہ پا گئی تو زن بچہ کو لٹھوں پٹوا دے
گی۔ حلوہ خوردن روئے باید۔ کس مُنہ سے اظہار کروں۔ سب کیا کرایا خاک میں
مل جائے گا۔ یہ جو کچھ عزت و قیمت خاطر مدارات ہے کچھ بھی نہ رہے گا۔ اور
بنی بنائی بات بگڑ جائے گی۔ مگر تڑپوں گا تو کہاں تک۔ اور نہ کہوں گا تو کب تک
مروں یا جیوں کہنا تو پڑے ہی گا۔ کس قیامت کی رات ہے کہ صبح ہونے کا نام ہی نہیں
لیتی۔ سینکڑوں ہی صورتیں اچھی بُری گوری کالی آنکھ سے نکلیں۔ مگر خدا گواہ ہے
اس آن بان کی عورت۔ ایمان کی بات تو یہ ہے۔ دنیا میں تو ہے نہیں آسمان
پر ہو تو ہو۔ یہ کیسی آفت ہے۔ کہ حُسن میں بینظیر اور پھر والیٔ سلطنت وہی کہاوت
ہو گئی ــــ کریلا اور نیم چڑھا۔ محتاج ہوتی۔ راج کروا تا۔ حاجتمند ہوتی چوری کرتا
ڈاکہ ڈالتا سر آنکھوں پر بٹھاتا۔ مگر کہاں میں کہاں وہ۔ گھر میں نہیں دانے بڑھیا
چلی بھُنانے۔ یہ بیل تو منڈھے چڑھتی نہیں۔ اچھا عذاب پیچھے لگا۔ جھونپڑوں کا
رہنا محلوں کے خواب۔ روٹی تو پیٹ بھر کر نصیب نہیں۔ شہزادی کا عشق ہوا۔
زندگی ختم ہونی تھی ہو گئی۔

شب سیاہ نے آسمان کو کروٹ دی اور درّاج کے اس خبط پر صبح صادق
کھلکھلا کر ہنسی۔ نماز پڑھنے کا اتفاق تو شاید عمر بھر نہ ہوا ہو۔ مگر اذان کی آواز
کان میں آتے ہی جان میں جان آگئی۔ باہر آیا تو وزیر اعظم سے مڈھ بھیڑ ہوئی۔
اندھا کیا چاہے دو آنکھیں طلبی کا پیغام زبانی سو کھے دھانوں میں پانی پڑ گیا۔
درّاج جیسا فقیر اور دربار دلی میں وزیر خوشی کے مارے باچھیں کھلی جاتی تھیں۔
مُنہ پر دو چار چھینٹے مار کر کپڑے بدل بدلا چلنے لگا۔ تو لڑکی بابا بابا کہتی ہوئی اُٹھ
بیٹھی۔ مگر وہ بچی کو روتا ماں بہنوں کو سوتا چھوڑ چھاڑ گاڑھی میں بیٹھ دربار میں

جا حاضر ہوا۔

دربار کا کوئی خاص اہتمام نہیں دربار عام نہیں۔ خاص دربار وہ بھی بضرورت چند معزز عہدہ دار ان گنے اہل کار دائیں بائیں اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے تھے اور بیچ میں ملکہ شاہین تخت شاہی پر جلوہ گر تھی۔ دراج کا داخل ہونا تھا کہ ملکہ اور ملکہ کے ساتھ ہی تمام دربار استقبال کو اٹھ کھڑا ہوا۔ شہزادی کی اس عنایت پر لوگوں کو تعجب ہوا ہو خواہ حسد مگر سب دم بخود کھڑے تھے۔ دراج سے بھی کو اتنی امید تھی نہیں۔ مگر خدا جانے کسی نے پڑھا سکھا کر بھیجا یا عشق نے یہ آداب سکھا دئے۔ مجرا کیا زمین بوس ہوا۔ اوپر نگاہ اٹھا کر دیکھتا ہے تو دھانی جوڑا ستم ڈھا رہا تھا۔ ارکین دربار کو دراج کی یہ حرکت ضرور ناگوار ہوئی اور بعض تاڑنے والے تاڑ بھی گئے۔ مگر روک ٹوک تو در کنار کسی کی اتنی ہمت بھی نہ پڑی کہ نیچی سے اونچی نگاہ کر لیتا۔ سلام کر کے ٹھٹکا تو ملکہ نے اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ آگے بڑھا اور دعائیں دیتا ہوا جا بیٹھا۔ کشتی زرنگار میں خلعت ہفت پارچہ پہلے ہی سے رکھا تھا پیش کیا گیا۔ اور ایک بیش قیمت دوشالہ جس میں چاروں طرف ہیرے اور جواہر ٹنک رہے تھے۔ شاہین نے اپنے ہاتھ سے عطا کیا ضرورت نے سب باتیں سکھا دیں کھڑا ہوا۔ سر پر رکھا آنکھوں سے لگایا اور شکریہ ادا کیا۔

دربار ختم ہوا اور درباری رخصت ہوئے۔ ملکہ گاڑی میں بیٹھ دراج کو ساتھ لے کر محل میں آئی۔ کمرہ خاص میں بٹھانے کا حکم دیا۔ اور تھوڑی دیر بعد خود بھی آ پہونچی۔ دھانی کے بدلے اب زعفرانی جوڑا تھا اور تاج شاہی کے بجائے جواہرات سے لپی ہوئی چادر زلف سرکش سے سرگوشیاں کر رہی تھی۔

دل تو گرفتار کی امنگیں شاہین جیسی ملکہ آنکھ کے سامنے اور تنہائی کا عالم غریب دراج کا خدا ہی نگہبان تھا منہ میں زبان نہ تھی۔ بدن میں جان نہ تھی تصویر کی طرح

گم سُم بیٹھا تھا۔
شاہین لاکھ کم سن ہزار ناتجربہ کار سہی۔ مگر تھی تو شہزادی سینکڑوں آدمی روزانہ
نگاہ سے نکلتے تھے۔ تاڑ تو کل ہی گئی تھی آج اچھی طرح سمجھ گئی۔ کہ میرے حُسن کا
جادو دَراج پر چل گیا۔ کچھ دیر تو اس اُمید پر چپکی بیٹھی رہی کہ یہ اب کچھ بولے۔ اب کچھ
بولے۔ مگر جب دیکھا کہ اس کو سانپ ہی سونگھ گیا۔ لاکھ موقع تنہائی دوں لیکن کچھ
رعبِ حُسن کچھ آدابِ شاہی۔ یہ اسی طرح گم سُم رہے گا تو مجبوراً خود ہی پیش قدمی کی۔
ایک تمکنت آمیز نظر جس نے غریب کا کلیجہ تک چھلنی کر دیا۔ دَراج پر ڈالی اور مُسکرا کر کہا
"کچھ مُنہ سے بولو سر سے کھیلو تم تو بالکل ہی تصویر ہو گئے" آبِ رواں کی ہلکی
سی نقاب نے حسن کی آب و تاب کو دوبالا کر رکھا تھا۔ اس اوٹ نے اور بھی لوٹ
پوٹ کر دیا۔ گہرا رنگ کتابی چہرہ بڑی بڑی آنکھیں پتلے پتلے ہونٹ رنگ میں رلا آہستہ
چہرہ پر نزاکت۔ آنکھوں میں جادو لبوں پر تبسم عقل ٹھکانے سے بے ٹھکانے ہوتی۔
صبر و شکیب غارت شرم و حیا برباد۔ دلدادہ دَراج اٹھا اور یہ کہتا ہوا پاؤں پر گر پڑا۔
"اے حسینہ ایسی تیرے دربار میں آ کر لٹ گیا"
تقاضائے انسانیت یہ تھا کہ شاہین ہاتھ سے سر اٹھا کر بات پوچھتی خلاف
شان تھا۔ پاؤں پر گرنے ہی نہ دیتی۔ دلاسا تسلی تشفی تسکین۔ دل سے نہیں
دکھاوا اور ہی نہیں ظاہری دوپٹہ سے آنسو پونچھ دیتی تو کچھ شان کو بٹہ نہ لگ جاتا
دَراج کون بڑا رئیس تھا۔ ٹکے کا آدمی بھیڑ کی لات گھٹنوں تک اور نیچے سے انسان
میں باغ باغ ہو جاتا۔ ملکہ تھی تو ہو۔ مہمان نوازی تو فرض تھا۔ دَراج کو راضی کر دینا
نہ کچھ بڑا کام تھا نہ کوئی عظیم الشان مہم۔ مگر خدا اس محبت کو غارت کرے۔ وہ
احسان اور جان نثاری سب گئی گزری ہوئی مزے سے بیٹھی دیکھتی اور چین سے بیٹھی
ہنستی رہی کہیں پندرہ بیس منٹ کے بعد بولی تو یہ:۔

"خیر صلاح! کہو کہو کیا معاملہ ہے؟"

دَرّاج ۔ (سر اٹھاکر) "معاملہ تو صاف ہے ۔ مگر انصاف کیجئے ۔ سب سے بہتر فیصلہ تو یہ ہے کہ اُس باغی کی طرح مجھ کو بھی سولی کا حکم ہو۔"

شاہین ۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا مطلب ہے ۔ نگاہ ملاکر بات کرو ۔ وہ نہ چشم زدن میں آنکھیں کھل جائیں گی ۔ اس تنہائی میں جہاں لونڈی نہ ماما تو کرنہ چاکر تم کیا سمجھ کر میرے پاؤں پر گرے ۔ سوچا یہ ہوگا شہزادی ہے تو کیا ہے تو عورت ذات بہلا ۔ پھسلا رنگ پر لے آؤں گا ۔ بولو بولو! کہتے ہو کہ نہیں ایسا مزہ چکھاؤں گی ۔ کہ چھٹی کا لکھا یاد آجائے گا ۔ ڈرو مت جو کچھ کہنا ہے کہہ ڈالو ۔ خدا معلوم جان رہے یا جائے ۔ اور پھر کہنے کا وقت آئے یا نہ آئے ۔

دَرّاج ۔ میں ہی مُنہ سے کہہ کر کیا نہال ہو جاؤں گا ۔ میری صورت سوال ہے میں نے کہا میری حالت نے کہہ دیا ۔ رہی جان اس کو میں پہلے ہی قربان کر چکا بسم اللہ کیجئے ۔ ایسی موت تو خدا سب کو دے ۔ مٹ تو چکا ہی مرنا باقی ہے ۔ سو میں خود تیار ہوں یہ اور احسان ہوگا۔"

شاہین ۔ کیسا احسان اور کس بات کا شکریہ عطا خلعت نہ انوکھی چیز نہ نرالی بات دن رات ملتے رہتے ہیں ۔ احسان تو تمھارا ہے کہ تم نے جان بچائی ۔ زہے نصیب اس سلطنت کے جس میں تم جیسے جان نثار بستے ہوں اور دھن بھاگ اس والئے سلطنت کے جس کی رعیت میں ایسے ایسے وفادار موجود ہوں ۔ مگر تمھاری اس حرکت کا سبب کیا ہے؟

دَرّاج ۔ ملکۂ بلند اقبال! مجھ جیسا فقیر اور ان ہاتھوں سے وہ شالہ ۔ خدا کی شان یہ مُنہ اور یہ مصالحہ! رونگٹا رونگٹا دعا دے تو شکریہ محال اور کنبہ بھر قربان ہو جائے تو معاوضہ ناممکن ۔ البتہ ایک ارمان ہے :-

"سر آپ کے قدموں پہ ہو اور جان نکل جائے۔

"وفاداری شیوہ انسانیت اور جان نثاری جوہر شرافت ہے۔ یہ ہی زابلستان
جس میں رات بھر شیر اور ہاتھی دھاڑتے اور چنگھاڑتے رہتے تھے۔ آپ کے دم سے
جنت نشان بن گیا کون سا دن جاتا تھا کہ دس بیس فوجداریاں دو چار ڈکیتیاں سرِ راہ
نہ ہوتی ہوں۔ اور کون سی رات گزرتی تھی کہ دس پانچ چوریاں ایک آدھ قتل سننے میں نہ
آئے۔ یہ آپ ہی کا اقبال ہے کہ شیر بکری ایک گھاٹ پانی پی رہے ہیں چار دانگ میں انصاف
کا ڈنکا بج رہا ہے۔ سڑک پر سونا اچھالتے چلے جاؤ کیا مجال جو کوئی آنکھ اٹھا کر دیکھ لے
جو ساری ساری رات کھٹکوں اور دھڑکوں میں گزار دیتے تھے چین سے میٹھی نیند سوتے
ہیں محتاج یتیم رانڈیں دکھیاریاں جن کی عمریں فاقوں میں تیر ہوئیں۔ دونوں وقت
مگن ہو کر ہزاروں دعائیں دیتے ہیں۔ رحم دل شاہین منصف مزاج ملک ہیمانے
جو کچھ کیا میرا فرض تھا احسان نہ تھا۔

شاہین: "اچھا تم اٹھو اور میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔"

مہمان نوازی

شاہین جواہرات میں لدی عطر میں ڈوبی پھولوں میں بسی خوشبو سے مہک رہی تھی سپید براق گلے میں جڑاؤ چمپا کلی ڈگڈگی کے پاس پہلڑا مالا کے ساتھ ست لڑا آٹھ انگل چوڑا گلوبند بیچ میں دو ہیرے۔ دمکتا ہوا سونا چمکتے ہوئے لعل چاندنی صورت۔ بڑا سا قد دُرّاج کو تو ایک ایک قدم اٹھانا بھاری تھا تھم تھم کر بڑھا بیٹھ بیٹھ کر اٹھا گر گر کر سنبھلا اور سنبھل سنبھل کر چلا کمرۂ طعام میں پہونچے تو خدام دست بستہ موجود تھے۔ ہاتھ دھوئے دھلوائے اور کھانا کھانے ساتھ بیٹھی سونے چاندی کے برتن انواع اقسام کے کھانے۔ ایرانی پلاؤ شیرازی متنجن اصفہانی قورمہ اور خراسانی کباب دُرّاج نے تو شاید خواب میں بھی یہ سامان نہ دیکھے ہوں گے۔ دسترخوان دیکھتے ہی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ شاہین کی میزبانی ضرور قابل شکریہ ہے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ مہمان بدنصیب کی خود ہی جان پر بنی ہوئی تھی۔ چولھے میں گیا کھانا اور بھاڑ میں گیا کھلانا بار بار اصرار سے ایک نوالہ مُنہ میں ڈالا۔ مگر کہاں جاتا اور کس طرح اُترتا۔ آخر با اقبال شہزادی نے اپنے ہاتھ سے شیرمال کا ایک ٹکڑا توڑ کر پیش کیا اور کہا۔

"ایسے کے ٹکڑے کہ کھانا بھی بھول گئے"

آنکھوں سے لگا کر شکریہ ادا کیا اور جس طرح ہوا دو چار لقمے زبردستی حلق سے اُتارے کھانے سے فراغت پا کر ایک اور کمرے میں آئے۔ یہاں دیوار پر ایک تصویر تھی جس میں شہزادہ زنجبار اپنی محبوبہ کے پاس بیٹھا بصد حسرت و یاس اُسکے چہرے کو تاک رہا تھا۔

شاہین "جانتے ہو یہ تصویر کس کی ہے؟

دُرّاج مجھے اپنا ہی ہوش نہیں تصویر کا پہچاننا تو بڑا کام ہے۔ مجھے تو صرف اتنی خبر ہے۔

از آتشم ز عشق شرارے بمردن نہ جست
بنگر کہ سوختیم و چہ مردانہ سوختیم

شاہین:" ماشاء اللہ چند ہی گھنٹوں میں مرحلے طے ہو گئے کس کا عشق ہے ؟ ۔
زبان نے جہاں تک یاری دی جس قدر ہمت دلائی ادھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا مگر جہاں حرف مطلب تک پہونچا آپ تھم، زبان بند سوچتا تھا کہ اگر دل کڑا کر کے کہہ بھی دوں تو شہزادی ہے اور سچ مچ کی شہزادی صاحب سلطنت والئی حکومت زبان ہلانے کی دیر ہے ایسا کھو کھوئے گی کہ نشان تک نہ رہے گا مجبور یہی کہتے بن پڑی کیا بتاؤں ملکہ میری صورت سوال ہے ۔

شاہین: میں تو ایسی جاتم نہیں ہوں کہ اُڑتی چڑیا کو پہچان لوں ۔ بولو تم نہیں بتاؤ تم نہیں سمجھوں کیا خاک ۔ یوں تو ماشاء اللہ زبان قینچی کی طرح چلتی ہے ۔ حال بیان کرنے میں صورت سوال ہو گئی ۔ اچھا اب آپ تشریف لے جائیے مجھ کو کچھ کاغذ دیکھنے ہیں ۔

دراج:" اب کب حاضر ہوں ۔
شاہین:" جب آپ کو فرصت ہو اور جی چاہے "
دراج:" میرا جی اب ہی کب اُٹھنے کو چاہتا ہے "
شاہین:" بس تم بیٹھے رہو میں جاتی ہوں "
دراج:" اب اس طرح تو ہر جگہ بیٹھ سکتا ہوں یہیں کیا خصوصیت رہی "
شاہین:" کل شام کو آنا "
دراج:" خدا حافظ "
شاہین:" اچھا! "

غسلِ شیر

دروغ برگردن راوی سردار عبدالرحمٰن عثمانی کا بیان ہے کہ ایک دو نہیں اکٹھے چھ ساڑھے چھ مہینے ایسے گزرے کہ دُرّاج دن رات میں تین تین چار چار پھیرے کرتا اور شاہین اس سے بلا تکلف ملاقات کرتی مہینہ بیس روز تو آشنائی رہا کہ کچھ دنیا کا خوف کچھ لوگوں کی شرم آبرو کا لحاظ عزت کا پاس دن کو برائے نام سہی پر نقاب ڈال لیتی۔ اور پھر تو طبیعت کو ہوا لگا دو آپ ٹھہری شہزادی نہ کوئی کہنے والا۔ روکنے والا نہ ٹوکنے والا۔ وہ جھجک اور شرم سب گئی گزری ہوئی کھلم کھلا ملتی اور بانکے پکارے بلواتی۔ ذرا دُرّاج کے آنے میں دیر ہوئی اور اس نے آدمیوں کی ڈاک بٹھا دی۔ اراکین سلطنت دیکھتے اور چپ ہو رہتے کس کی مجال تھی کہ دم مار سکتا۔ آدھی رات کا وقت جاڑے کا موسم۔ کوچوان غریب گاڑی پر بیٹھا سوں سوں کر رہا ہے اور اُف نہیں کر سکتا پھر یہی نہیں کہ کبھی کبھار بلکہ روزمرہ اور بلاناغہ۔ نوکر پریشان مامائیں حیران ایک دن کی مصیبت ہو تو بھگت لی جائے۔ روز کی آفت، اور ہر وقت کی دقت۔ رات کے بارہ بج گئے۔ کھانا رکھا رکھا مسخ ہو گیا جو ہے وہ مجبور اور معذور آپس میں سرگوشیاں کرتے اور دُرّاج کی جان کو دعائیں دیتے رہی شاہین جس کے کرۂ خواب میں پرندہ پر نہ مار سکتا تھا رات بھر دُرّاج کے ساتھ قہقہے مارتی ضروری کاغذ پڑے جھک مارتے اہلکار بیٹھے کھڑے شل ہو جاتے اور وہ آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتی حکم احکام بند۔ مقدمات چوپٹ۔ غرض چار ہی دن میں کچھ کا کچھ ہو گیا جس کا انصاف عدل نوشیروانی کہلاتا تھا مہینوں تخت عدالت پر بیٹھنے کا نام نہ لیتی۔

شہباز خان وزیر اعظم شاہین کے دادا کے زمانہ کا آدمی بڈھا پھونس، شاہین جیسی سینکڑوں ہاتھوں میں بھری پڑی تھیں۔ یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر وہ شروع ہی میں

کھٹک گیا تھا۔ مگر چور کی مانند گھٹنوں میں سر دیے اور دم دبے چپکا بیٹھا سارے سوانگ
دیکھتا اور اُف نہ کرتا۔ گو وزیر تھا مگر ایسا نمک حلال کہ گو سلطنت زابلستان کو
قیامت تک نصیب نہ ہوگا۔ شاہین اس کی گود کی کھلائی سامنے کی پلی پالی بیٹیوں
سے زیادہ سمجھتا تھا۔ اپنی ٹانگ کھولے اور آپ لاچار مرے خون کے سے گھونٹ پی
کر چپکا ہو جاتا۔ وزراج کا کام تمام کر دینا شہباز کے بائیں ہاتھ کا کھیل۔ شاہین دو چار
روز رو دھو کر ٹھیک ہو جاتی۔ مگر سمجھدار آدمی زمانہ برتے ہوئے سینکڑوں
رنگ دیکھے ہوئے سوچتا تھا کہ عورت اور پھر شہزادی تریا ہٹ اور راج ہٹ
دو دو مصیبتوں کا سامنا ہے خدا معلوم کیا اینڈا بینڈا حکم دے۔ بیٹھے سوچتے سوچتے
یہ تدبیر سمجھ میں آئی کہ کسی طرح وزراج کو شیشہ میں اتار دوں۔ دو چار وقت یوں ہی ملا۔
ایک آدھ دفعہ عورت کی چھیڑ رفتہ رفتہ وہ میل جول بڑھا کہ تمام زابلستان دنگ ہو گیا
وزراج سمجھ کا کورا عقل کا اندھا شہباز کے پھندے سے بچ کر کہاں جاتا۔ وہی باتوں
میں بندہ بے دام ہو گیا۔ شاہین جیسی ملکہ طالب گار شہباز جیسا وزیر مددگار وزراج سے
زیادہ خوش نصیب کون ہوگا۔ جاڑا گیا برسات آندھی آئے مینہ جائے۔ مگر شہباز
کی ملاقات نہ جائے شاہین کے پاس سے اٹھا اور سیدھا شہباز کے ہاں۔ پھر
غضب یہ جو گزری وہ شادی جو ہوئی وہ بربادی۔

نتیجہ یہ ہوا اور ہونا چاہیے تھا کہ شاہین کے تمام راز ایک ایک کر کے شہباز
کے قبضہ میں جا پہنچے۔ مان لیا کہ وزیر وفادار نمک حلال فرمانبردار جان نثار سب ہی
کچھ تھا مگر تھا تو غیر۔ وہ بیسیوں آنکھوں میں کھٹکا۔ اس بیچاری کو کیا خبر تھی کہ یہ
میری عنایتیں اور مہربانیاں میل کا بیل اور تل کا پہاڑ بن جائیں گی۔ خدا کو جان
دینی ہے اور شاہین کا پیٹھ پیچھے علامہ ابن نصر جو اس واقعہ کا پہلا محقق اور
زابلستان کا معتبر مورخ سمجھا گیا ہے لکھتا ہے:-

"گو ان تعلقات کا چرچا بچے بچے کی زبان پر تھا، مگر تمام زابلستان چھان مارا۔ اور ایک شہادت بھی ایسی نہ ملی جس سے شاہین کے دامن عصمت پر کوئی دھبہ لگ سکتا۔"

محبت مروت عنایت شکایت سب سہی! اس تک سے انکار نہیں کہ ایک دو دفعہ کیا دنوں اور مہینوں متواتر لگاتار اور پھر گھنٹوں اور پہروں دونوں بیٹھے باتیں کرتے۔ باتیں قہقہے بے تکلفی چھیڑ چھاڑ سب کچھ ہوتا اور دن دہاڑے ہوتا مگر اس کے آگے دونوں میں سے ایک کی ہمت نہ پڑی یہ اس مری ہوئی ماں کا فیض صحبت اور دودھ کا اثر تھا کہ شاہین ایسا خیال آتے ہی خوف خدا سے تھرا اٹھتی ورنہ کس کی ننگ و ناموس اور کیسی عفت عصمت جو چاہا وہ کیا اور جو چاہتی وہ کرتی۔ بات صرف اتنی تھی کہ خود بینی اُس کے مزاج میں معمول سے زیادہ گھسی ہوئی تھی۔ اور اگر ہمارا خیال غلط نہیں تو یہی خود بینی معاوضہ احسان کے ساتھ سمند ناز پر ایک تازیانہ تھا جس نے یہاں تک نوبت پہنچا دی۔ وہ سمجھتی تھی کہ جہاں اور طرح طرح کے جانور اور بن بن کے پکھیرو میرے دربار میں بولیاں بول رہے ہیں۔ وہاں ایک دراج بھی "سبحان تیری قدرت" کے نعرے لگا رہا ہے۔

دراج اپنی حالت زار کا اظہار کرتا وہ دل میں خوش ہوتی وہ روتا وہ ہنستی وہ ہائے ہائے کرتا وہ ہاہا کرتی۔ اس سے انکار نہیں کہ دراج کی محبت کا اس کی طبیعت پر ایک خاص اثر تھا جو رفتہ رفتہ خود بھی محبت کے ضمن میں داخل ہو گیا۔ مگر اس کو کیا معلوم تھا کہ یہ دراج پیٹ کا ہلکا کانوں کا کچا رتی رتی اور تل تل شہباز سے جا پہونچے گا اور یہ گھر کا بھیدی ایک دن لنکا ڈھا دے گا۔

بقرعید کے دن مغرب کے بعد زابلستان کی مشہور رسم "غسل شمشیر" ادا ہو رہی تھی۔ سات قسم کی سات ہری تر کاریاں دائیں طرف رکھ کر وزیراعظم نے شہزادی کے پاؤں پر دودھ کے چھینٹے دیئے اور کین سلطنت نے باری باری اٹھ کر پھول نچھاور کئے اور ترقی اقبال کی

دعائیں دیں۔ اب چھنگلی میں مہندی لگانے کا وقت تھا۔ سلطانہ باغ کی مہندی شاہین کے اپنے ہاتھ کی توڑی ہوئی عطر و گلاب سے گندھی سونے کی تھالی میں رکھی آگے آئی شہباز خاں کھڑے کا کھڑا ہی رہا اور دراج کو مہندی لگانے کا حکم عطا ہوا چھوٹے سے بڑے تک سب سناٹے میں دم بخود تھے۔ مہندی کی رسم ادا ہوئی۔ شاہین دراج کو ساتھ لے محل پہونچی کھچڑی تو پہلے پک رہی تھی مہندی کے رنگ نے سب کو دنگ کر دیا۔

شاہین کا کمرۂ خواب یوں ہی ماشاء اللہ ایسا تھا کہ قدم رکھتے ہی نیند آ جائے۔ آج تو برس کا برس دن تھا مومی بتیاں کافوری شمعیں جھاڑ فانوس تمام کمرہ جگمگا رہا تھا۔ دراج کا کام تو مہندی ہی نے تمام کر دیا تھا۔ کمرے میں پہونچا تو حالت ہی کچھ اور تھی۔ ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور بے اختیار ہو کر کہنے لگا:۔

"اللہ کبھی میرا ارمان بھی پورا ہوگا"

شاہین "معاوضہ ارمان؟

دراج: جان!"

شاہین "لاحول ولا قوۃ"

دراج "اس سے زیادہ قیمتی چیز اور میرے پاس کچھ نہیں"

شاہین "تقدیر"

دراج۔ تقدیر کا پھیر تو تھا ہی جو ایسا ارمان دل میں پیدا ہوا"

شاہین۔ تو کیا تم اپنے تئیں بدنصیب آدمی خیال کرتے ہو"

دراج۔ ہرگز نہیں! مجھ سے زیادہ خوش نصیب اور کون ہوگا۔ جو چاہا وہ ملا جو مانگا وہ لیا۔ آپ جیسی ملکہ اور مجھ پر کرم اور پھر میں بدنصیب ہیں میں آپ سے بھی زیادہ خوش نصیب ہوں"

شاہین! تم کو معلوم ہے کہ میں کل رات کو دو مہینے کے واسطے اصفہان جاتی ہوں۔

دراج "تو جانے سے پہلے میرا انتظام فرما دیجئے۔ دو مہینے کیا میں تو دو لمحہ بھی زندہ نہیں رہ سکتا"

شاہین ۔ اس قدر مبالغہ سے کیا حاصل ؟ "

دراج ۔ تقدیر جو جو کچھ دکھائے گی سب دیکھوں گا لیکن میں اس خیال سے ضرور خوش ہوں کہ انشاء اللہ بہت جلد قربان ہو جاؤں گا ۔ اور یہی عین آرزو ہے ۔ انصاف کیجیے جس شخص کا رات دن میں ایک گھنٹہ بھی ایسا نہ گزرتا تھا کہ خیال سے مفارقت کر سکے وہ دو مہینہ کا فراق کس طرح جھیل سکے گا "

شاہین ۔ خیال کے فراق کی تو اب بھی ضرورت نہیں "

دراج ۔ اب تو ہر وقت یہ تسکین ہے کہ جو کچھ گزرے گی جا کر سنا دوں گا ۔ جب تسکین بھی گئی گزری ہو پھر کیا امید باقی رہے "

شاہین ۔ دراج ! یہ سب ڈھکوسلے ہیں ۔ خیر ! میں تم کو یہ ایک رومال دیتی ہوں جو پانچ چھ پشت سے میرے خاندان میں نسلاً بعد نسلاً امانت چلا آتا ہے ۔ میری پرنانی رابعہ خاتون نے اپنی ماں کی نشانی سمجھ کر میری ماں کو دیا ۔ جو میری مرحومہ ماں نے نکاح کے بعد میرے باپ کو عطا کیا اور پھر میرے پاس آیا ۔ اس کو بطور یادگار اپنے پاس رکھنا ۔ اگر کبھی میرا خیال آئے تو اس کو دیکھ لیا کرنا "

دراج " آہ ملکہ کیسی دل خراش گفتگو ہے ! اگر کبھی میرا خیال آئے ۔ کیا میری زندگی میں ایسا کوئی لمحہ بھی گذر سکتا ہے کہ آپ کا خیال مجھ کو نہ آئے "

شاہین ۔ اب تم جاؤ میں کچھ لکھوں گی ۔ آؤ ہاتھ ملا لو "

دراج ۔ دہاتھ میں ہاتھ لے کر) کس طرح شکریہ ادا کروں ۔ اس ہاتھ کو سر پر رکھوں آنکھوں سے لگاؤں "

شاہین " اچھا ! رخصت "

دراج " فی امان اللہ "

شاہین ۔ سلام "

فراق اور دھوکہ

تارے چمکے اور چھپے۔ چاند گھٹا اور بڑھا۔ دن نکلے اور ڈھلے۔ راتیں آئیں اور گئیں۔ انتظامِ عالم کے تغیرات کیا جاڑا کیا برسات۔ کیا دن اور کیا رات ہوئے۔ اور کھلم کھلا ہوئے۔ راتیں پھریں۔ موسم پلٹے۔ زمانہ بدلا۔ کلیاں پھول ہو ہو کر مرجھائیں۔ پھول کھل کھل کر کملائے۔ ہری بھری شاخیں سرسبز و شاداب ہو کے دیکھتے ہی دیکھتے ٹھنڈ اور سوکھی کھڑ ٹنک ڈالیاں آناً فاناً میووں سے لد گئیں۔

کارخانۂ قدرت کا ہر ذرہ متحرک اور حیاتِ انسانی کا ہر حال متغیر مگر قیام تھا تو غریب دراج کی مصیبت میں۔ ہر چند کوشش کرتا کہ کسی طرح دل کو گم نشار کو تسکین ہو لیکن شاہین کا فراق بلائے بے درماں۔ ایسا ہاتھ دھو کر پیچھے پڑا کہ چند ہی روز میں مُردوں کی سی صورت ہو گئی۔ دیوانہ وار ادھر ادھر پھرتا مضطرب و بیقرار ہر طرف جاتا۔ مگر خدا بھلا کرے جشن نوروز کا کچھ ایسی گھڑی کی آگ لگی کہ جتنا بجھاتا تھا اتنی ہی زیادہ بھڑکتی تھی۔ ماں بہنیں۔ دوست آشنا۔ عزیز و اقارب اپنی اپنی جگہ سب ہی نے سمجھایا۔ مگر کیسی درستی اور کس کی اصلاح۔ کہاں کی بہن اور کدھر کا بھائی۔ وہ اس کو ایسے تھے جیسے گائے کو قصائی۔ محل کے نیچے جاتا۔ ٹھنڈے سانس بھرتا۔ جنگلوں کی سیر کرتا۔ میدانوں کی خاک اڑاتا۔ وحشیوں کی طرح رہتا۔ دیوانوں کی طرح پھرتا۔ ریگستان کا وحشت خیز جنگل۔ دوپہر کا سنسان وقت۔ نصف النہار کا سورج۔ سر پیرا بگولہ کے زرد زرد پھول دائیں بائیں دریائے ماموں آنکھ کے سامنے ہوتا۔ اور شاہین کا شیدائی دیوانہ و سودائی دراج خانہ برباد اپنی محبوبہ کی یاد میں صبح کو دوپہر اور دوپہر کو شام کرتا۔ آخری مہینے کی اندھیری راتیں ان ہولناک ویرانوں میں بسر ہو جاتیں۔

جہاں دن دہاڑے جاتے کلیجے دہلتے تھے۔ دوسرے تیسرے دن گھنٹہ آدھ گھنٹہ کو
گھر جاتا تھوڑا بہت کھایا جدھر منہ اٹھا چمپت ہوا۔ وہی ورراج جو کسی وقت
یکا سیر بھر اناج اس طرح نمٹاتا کہ بھورا تک نہ بچے۔ اب دو دو تین تین وقت
کے بعد آدھ پا تین چھٹانک کھا لیتا ہو گا۔ وہ بھی کچھ عزیزوں کی زبردستی کچھ نزاکتوں
کا کہنا سننا۔ انجام یہ ہوا۔ کھانے کی لاپروائی غم سے پڑا پالا تسکین ہوتی
نہیں۔ طاقت تھی کہ دن بدن گھٹنے لگی سکت و توانائی رخصت ہو چکی کس بل غائب غلہ
ہاتھی جیسا ڈیل سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ انگوٹھی پر نثار رومال پر قربان خیال پر فدا
دو مہینے کا فراق قیامت کا سامنا تھا جس نے ہوش و حواس سب کھو دیئے۔
ایک دفعہ رات کے وقت کنارِ دریا پر بیٹھا شاہین کے خیال میں غرقاب تھا نگاہ
آسمان پر جا پہنچی۔ چاند مدھم پڑ چکا تھا۔ تارے ٹوٹ ٹوٹ کر جھڑ رہے تھے۔ کچھ دیر
تک دیکھتا رہا اور پھر بے ساختہ چلا اٹھا۔
"ہاں ہاں! سات سہیلی کے جھمکے نکل نکل چھپ چھپ کے نکل اور ماند ہو ہو کے
چمک۔ مگر شاہین کی صورت نہ دکھائیو" ابھی یہ الفاظ ختم نہ ہوئے تھے کہ ایک
سانڈنی سوار روشنی ہاتھ میں لئے قریب آیا اور کہا:۔
"مرزا صاحب! میں صبح سے تلاش کر رہا ہوں یہ ملکہ بلند اقبال کا خط ہے"
سانڈنی سوار خط دے کر رخصت ہوا۔ رات کا پچھلا پہر اندھیرا گھپ چاروں
طرف خیال دوڑایا۔ مگر شہباز خاں کے سوا کوئی اور ایسا سمجھ میں نہ آیا جو اس
راز میں شریک ہوتا۔ نہال نہال بشاشم بشاشم اچھلتا کودتا ڈیرے پہنچا۔
شہباز خاں ایک چلتا ہوا آدمی تھا ٹھگوں کا بادشاہ۔ مکاروں کا پیر۔ اس نے پہلے
اصلی خط جو طلبی کا تھا غائب کر دیا اور اس مضمون کا فرضی خط کہ
"میں آج کے چوتھے روز زابلستان آتی ہوں" ورراج کو پہنچا دیا۔

خط کھول کر پڑھا۔ خوشی کے مارے اُچھلنے لگا۔ شاہین کے خط کا یقین ایک ایسی زبردست تسکین تھی جس نے اُس تمام رنج و الم کو فرحت و انبساط سے بدل دیا۔ جان میں جان آ گئی کبھی سر پر رکھتا کبھی آنکھوں سے لگاتا۔ کھولتا۔ بند کرتا۔ رکھتا۔ اُٹھاتا۔ خدا معلوم اس کاغذ کے پرزہ میں کیا جادو تھا کہ وہ افسردگی اور خمودگی سب جاتی رہی۔ آمد کا انتظار اُمید دیدار۔ اشتیاق ملاقات۔ چار دن اور چار رات کاٹنے قیامت تھے۔ ایک ایک لمحہ ایک ایک سال زندگی اجیرن جان وبال غرض خدا خدا کر کے تین دن گزرے۔

شہباز خاں وزیر اعظم شروع ہی سے تاک میں تھا موقعہ کو غنیمت اور فرصت کو نعمت سمجھ ویسی ہی انگوٹھی اُس ہی جیسا رومال تیار کرا کر چپ چاپ ہو بیٹھا۔ چوتھے روز صبح کے وقت دراج انگلی میں انگوٹھی ہاتھ میں رومال شہباز کے جال میں پھنسا بیٹھا تھا کہ ایک خادم نے آ کر کہا "پانی تیار ہے"

شہباز۔ مرزا صاحب۔ اب آپ غسل فرما کر پوشاک تبدیل کیجئے۔ انگشتری اور رومال میرے پاس رکھ جائیے۔

شہباز عیار فیلسوف۔ دراج گیگلا مسکین بیوقوف۔ زبردست کمزور کا مقابلہ کیا شہباز اور دراج کی جوڑ کیسی۔ وہ باتوں کا مہمان۔ وہ چلموں کا محتاج۔ دراج بیچارے کی ہستی ہی کیا تھی۔ بڑے بڑے مدبر اور اچھے اچھے دور اندیش شہباز کے آ گے کانوں پر ہاتھ دھرتے تھے۔ دراج تو کس گنتی میں تھا آغا کا لال پاؤں پھر چھٹا انگوٹھی اور رومال دونوں بدلوا بیٹھا۔

دوپہر ہوئی شام ہوئی کیسی گاڑی کس کا گھوڑا۔ کہاں کی ملکہ۔ کدھر کی شاہین۔ سواری نہ شکاری۔ وہ تو شہباز کا حاشیہ تھا جس کی دراج کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوئی۔ وہ اُس تحریر کا نوشتہ تقدیر سمجھ رہا تھا۔ ساری رات محل کے نیچے اس اُمید پر گزار دی شہزادی اب آئے اب آئے۔

عقل کا اندھا یہ سمجھا زابلستان کی مالک اتنی بڑی سلطنت کی شہزادی لاکھ
چھپ چھپاتے آئے فوج نہیں ہمراہی ہمراہی نہیں اردلی اردلی نہیں۔ نوکر سو پچاس دس
بیس کچھ تو ہوں گے۔ صبح ہوئی تو جلا بھنا جیسے جیسے کھسیانی صورت زردی صورت شہباز
کے پاس پہنچا۔ تقدیر سے صلاح کار بھی ملا تو ایسا کہ اس نے ایک ہی وار میں تسمہ بھی نہ لگا
رکھا۔ ظاہر تو ہاں میں ہاں ملاتا رہا اور اندر خانے دراج کا اُٹھ کر جاتا تھا۔ دس
آدمی ہمراہ انگوٹھی اور مال قبضے میں کر معمولی سامان ساتھ لے اصفہان جا دھمکا۔ شاہین
کیسی ہی ہوشیار کتنی ہی سمجھدار لاکھ دوراندیش ہزار منتظم و سلیقہ شعار کچھ ہی تھی۔ مگر تھی۔
تو عورت اور اگر نہ بھی ہوتی تو شیطان نہیں فرشتہ نہیں ولی نہیں خدا نہیں اس کو ان تہہ در تہہ
کی کیا خبر کہ یہ بڈھا چنڈال کس میں جنگی ڈال چکا اور ہر گھڑی کی مثل کو اصل کر رہا ہے۔
سیدھے سبھاؤ دراج کا حال پوچھنے بیٹھ گئی۔

شہباز (شہزادی)۔ وہ زابلستان کا مشہور بدچلن اوباش۔ چھٹا ہوا بدمعاش۔
آپ نے پیٹھ پیچھے ہی اس نے ایک شکار چھانسا جمعدار شیر افگن سے تو سرکار واقف
ہیں۔ دن رات اس کی سالی کے ہاں پڑا رہتا ہے۔ سنتا ہوں نکاح بھی ہو گیا۔
اس نمک حرام نے جو جو کچھ مشہور کیا میری تو زبان بھی نہیں الٹ سکتی۔ سیر کی ہنڈیا میں
سوا سیر ٹیڑھا ابل گئی۔ آپ نے تو معاوضہ احسان کیا وہ سمجھا ملکہ کی نیت ہی کچھ اور
ہے۔ بھلا وہ ذلیل شرافت سے کورا مزاج کا چھچھورا آپ کی عنایتوں کے قابل تھا۔
اس کمبخت کی وجہ سے تو تمام شہر میں ڈھنڈورا پٹ رہا ہے اور بستی بھر میں ناک
کٹ رہی ہے۔ ایسا شخص تو صورت دیکھنے کے قابل نہیں (انگوٹھی اور رومال
آگے ڈال کر) یہ عطیہ شاہی اور جمعدار کی سالی جیسی واہی تباہی عورت گستاخی معاف
آپ نے بھی کمال کیا ایک معمولی آدمی کو یہ کچھ اعزاز بخشا۔ موری کی اینٹ چوبارے
چڑھی۔ وہ تو جو کچھ نہ کرتا۔ وہ تھوڑا وظیفہ تنخواہ سالانہ ماہانہ جو جی چاہتا مقرر

زماتیں یہ اور کس کو اچھی لگائی۔ باپ دادا کی عزت، بڑوں کی لاج سب دراج کی
نذر ہوگئی۔ بچے سے لے کر بڑھے تک کیا مرد اور کیا عورت جدھر جاؤ یہی مذکور اور
جہاں دیکھو یہی چرچا سنتے سنتے کان تھک گئے اور دیکھتے دیکھتے کلیجہ پک گیا۔
شہباز اپنا دام تزویر بچھائے کھڑا تقریر کر رہا تھا اور شاہین کی یہ کیفیت کہ ایک
رنگ آرہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔ انگوٹھی رومال دیکھتے ہی آگ بگولا ہوگئی۔ شہباز
جھوٹا تھا خواہ سچا مگر دراج سامنے ہوتا تو وہ کچا کھا جاتی۔ منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔
بدن تھر تھر کانپ رہا تھا اصفہان کا ایک ایک لمحہ وبال ہوگیا کہتی تھی کہ کسی طرح پر لگ
جائیں اڑ کر پہنچوں اور اس نابکار کا سر اڑا کر کلیجہ ٹھنڈا کروں منتظر تھی۔ اس کے
آنے کی یہاں جو دیکھا تو معاملہ ہی الٹ پلٹ کہاں کی تعمیل اور کس کا آنا رنگ ہی دوسرا
تھا تلووں سے جو لگی تو منہ تک پہونچی آؤ دیکھا نہ تاؤ سب جھگڑے چھوڑ چھاڑ
وزیر کو ساتھ لے جھٹ پٹ زابلستان روانہ ہوگئی۔

مرضِ متعدّی

شہباز کی روانگی لاکھ پوشیدہ ہو مگر اتنا بڑا آدمی وزیرِ سلطنت! جانے کی دیر تھی تمام شہر میں مشہور ہوگئی۔ دُرّاج کا ماتھا تو سنتے ہی ٹھنکا تھا۔ مگر سیدھا آدمی دل آئینہ حسد نہ کینہ بات کا پورا قول کا سچا۔ بہتیری ہی عقل لڑائی لیکن تہ کو نہ پہنچا انتظار کی حد صبر کی انتہا ایک آدھ روز تو بہت ہی سخت مصیبت میں رہا۔ دیوار و در سے ٹکریں ماریں پہاڑوں سر پھوڑے۔ مگر خدا کی شان دیکھو کہ ڈھیر میں کھاج مفلسی میں آٹا گیلا۔ ابھی وہ مصیبت ختم نہ ہوئی تھی کہ ایک اور آفت کا سامنا ہوا۔

جمعہ کی صبح کو سیدھے ہاتھ میں سپید سپید ہلکے ہلکے دھبے دکھائی دیئے۔ دیکھنے میں تو معمولی تھے۔ مگر جلن اور کھولن کس غضب کی کہ الامان الحفیظ شام تک تو سارا ہاتھ سوج کر کپا ہو گیا۔ رات کس مصیبت کی کٹی ہے۔ کہ خدا دشمن کی بھی ایسی نہ کاٹے۔ صبح کو تو مرض کی حالت ہی کچھ اور تھی جسم بھر میں پھپھولے اور اس میں سوزش۔ یا ادھر فراق کی چھریاں ادھر مرض کے نشتر مجبور معذور علاج کا قصد کیا۔ سلطنت کا طبیب حاذق اسفندیار کچھ دیر تک تو غور سے دیکھتا رہا اور پھر تو اس طور سے بھاگا۔ کہ سب متعجب ہوگئے۔ دور جا کر کھڑا ہوا اور وہیں جا کر للکارا۔

"بہتر ہوگا کہ آپ چلے جائیں۔ یہ ایک ایسے مرضِ متعدی کی ابتدا ہے جس کا علاج خدا کے ہاں بھی نہیں مجھ کو اندیشہ ہے کہ آپ کی وجہ سے یہ بیماری تمام سلطنت میں نہ پھیل جائے جس کو آپ کی ہوا بھی لگے گی وہ اس آزار میں گرفتار ہوگا۔

دُرّاج بدنصیب کے واسطے اس سے زیادہ مصیبت کا وقت اور کون سا ہوتا؟۔

طبیب کے الفاظ نے ساری ہی امیدوں کا خاتمہ کر دیا۔ آسمان کی طرف دیکھ کر خدا کا شکر کیا اور کہنے لگا:-

"آہ! خالق الموجودات ایک بھی ارمان پورا نہ ہوا۔

مرض کی تکلیف لمحہ بہ لمحہ زیادہ ہو رہی تھی۔ مگر شاہین کا خیال دم بھر کو بھی پیچھا نہ چھوڑتا تھا۔ گو جسمانی تکالیف نے جان پر بنا دی تھی لیکن روحانی تکالیف سے چہرے کا رنگ متغیر ہوا جاتا تھا۔ کچھ دیر تک سوچتا رہا اور پھر آپ ہی آپ کہنے لگا۔

"اب گل اندام شاہین کے قریب جانا ایسی محسنہ اور ایسی حسینہ کو جان بوجھ کر آزار لگانا تقاضائے محبت نہیں ہے"

آمنا سامنا

شام کا وقت قریب تھا۔ دراج حسرت نصیب نیم مردہ اور ٹڈھال لوگوں سے بچا سڑک کے کنارے چلا جا رہا تھا کہ شاہین کی سواری نظر آئی کیسا دردانگیز سماں تھا وہی دراج جس کے دل میں ہزاروں ارمان بھرے تھے بصد حسرت دریاسما شاہین کو دیکھنے لگا۔ دراج کی صورت دیکھتے ہی شاہین کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ حکم دیا۔

"فوراً محل پر حاضر ہو!"

حسرت بھرا دل یہ حکم سن کر گم سم رہ گیا۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے کلیجہ کسمسانے لگا مگر سچی محبت نے تعمیل کی اجازت نہ دی۔

شاہین آگ بگولہ محل میں پہونچی۔ جوں جوں دراج کے آنے میں دیر ہو رہی تھی غصہ اور زیادہ بھڑک رہا تھا! جو آدمی گیا وہ واپس جو پیغامبر بھیجا وہ ناکام۔ بات دل میں بیٹھ ہی چکی تھی۔ دیر اور پھر دیر پر انکار حق الیقین ہو گیا جلتی بھنتی سانپ کی طرح سر دھنتی باہر آئی اور شہباز کو طلبی کے واسطے روانہ کیا۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں اس سے بہتر موقعہ اور کون سا ملتا۔ ادھر اُدھر پھیر پھار آن موجود ہوا اور کہنے لگا۔

"وہ اُسی جمعدار کے ہاں بیٹھا بنکار رہا تھا۔ مجھ سے بات بھی نہیں کی۔ اندر ہی سے کہہ دیا۔ ملنے کو جی چاہتا ہے۔ تو شہزادی خود کیوں نہیں آجاتی"

نمک حرام شہباز ایسا ہاتھ دھو کر پیچھے پڑا کہ آخر غریب دراج کی جان لے کر چھوڑی اب کیا کسر رہ گئی۔ لال پیلی پہلے ہی ہو رہی تھی اتنا سنتے ہی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ وزیر کو دیکھا اور حکم دیا:۔

"گرفتار کرو اور علی الصباح سر بازار سولی دو"

قتل

شہباز تو خیر اسے چاہتے تھے۔ آرزو بھی تو یہ! اور ارمان تھا تو یہ۔ حکم سنتے ہی جان میں جان آ گئی۔ کوتوال کو ساتھ لیے تیز تر دن میں گرفتار کر جیل خانہ بھیج دیا۔ مگر شاہی سوئی نہ تھا کہ چھپ جاتا۔ چھ گھڑی کی لوپ چلنے تک تو بچہ بچہ کی زبان پر دراج کا چرچا تھا۔ صبح ہوتے ہی ادھر شہباز تھا ایک طرف جنگی جوان دوسری طرف برق انداز دراج کو مقتل میں لے حاضر ہوا۔ ادھر شعبانہ دراج کی چھوٹی بچی ننگے پاؤں مقتل میں آئی حسرت بھری نگاہ سے باپ کی طرف دیکھا کچھ دیر تک تو حیران پریشان چپ کھڑی رہی پھر فرط محبت سے بے قرار ہو کر چلا اٹھی۔

"بابا من نیز حاضر شدم"

بیٹی کی اس صدائے جگر خراش نے باپ پر ایک عجیب حالت طاری کر دی۔ گردن میں طوق تھا بمشکل منہ پھیر کر دیکھا۔ دراج کی نگاہ کا پڑنا تھا کہ شعبانہ بے تابانہ آگے بڑھی۔ باپ کے پاؤں سے جا لپٹی اور منہ اٹھا کر اس کے چہرے کو تکنے لگی۔ زنجیر کا کانٹا جو ہاتھ میں پڑا تھا اپنے ہاتھ سے ہٹا کر پوچھنے لگی۔

"بابا ایں چیست؟ چوڑی کا؟"

معصوم بچی کی بھولی بھالی باتوں نے مظلوم باپ کے کلیجے کے ٹکڑے اڑا دیئے۔ مشکیں بندھی ہوئی تھیں۔ نیچے بیٹھ گیا اور بچی کو چھاتی سے لگا لیا۔ محبت نے جوش کیا۔ آنکھ سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ باپ کو روتا دیکھ شعبانہ چیخیں مارنے لگی۔

باپ بیٹی کی آخری ملاقات کا منظر کچھ ایسا مؤثر تھا کہ شہباز جیسا سنگ دل آدمی بھی دم بخود رہ گیا۔ طوق کے ساتھ ہی ساتھ ننھے ننھے ہاتھ باپ کی گردن میں

پڑے تھے محبت بھری نگاہوں سے چہرے کو تک رہی تھی۔ اور ننھا سا حسرت بھرا دل دھکڑ دھکڑ کر رہا تھا۔ چار پانچ برس کی بچی کی بساط ہی کیا۔ باپ چند لمحہ کا مہمان تھا اور وہ پانچ برس کی جان کچھ ایسی باتیں ملا رہی تھی کہ سب گم سُم تھے۔ باپ کے مُنہ پر مُنہ رکھ دیا اور نہایت خوشامد سے کہنے لگی :۔

"بیا! خانہ بروئیم!"

بیٹی کی یہ درخواست ایک تیر تھا جو باپ کے کلیجے سے پار ہو گیا۔ بیار کیا بچی کا سر ہاتھ پر پھیرا اور کہا :۔

"شعبیانہ! پدر را خدا حافظ بگو"

خاتمہ

گرمی کا موسم صبح کا سہانا وقت۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے مقتل زار ملتان سے ملا ہوا لیفاری قبرستان دُنیائے ناپائیدار کی بلند صدائیں لگا رہا تھا۔ سنگِ مرمر کے سپید مزارِ حیاتِ انسانی کی بے ثباتی کا پیش خیمہ تھے۔ کچی پکی قبروں کے بسانے والے جو اپنے گھر بار کو چھوڑ پیاروں سے منہ موڑ بے خبر سوتے تھے۔ جسدِ خاکی کے استقبال کو صف بستہ کھڑے دراز بے گناہ کے عبرت ناک قتل کو چشمِ افسوس سے دیکھ رہے تھے۔ ان مٹ جانے والی صورتوں میں بہت سے ایسے تھے جو عمر بھر اپنی غرض کے بندے رہے۔ فاتحہ نہ درود جئے تو فضول۔ مرے تو مردود۔ تن پروری کو مقصدِ حیات سمجھ کر وقت پورا کر آئے۔ اور خود غرضی کو سب سے بہتر اصول سمجھ کر زندگی ختم کر دی۔ جسدِ ناپائیدار کی جھوٹی سچی نشانیو آج کوئی آشنا نہیں کہ تمہارے مٹی کے ڈھیروں پر دو پھول چڑھا دے۔ تمہارے ارادوں کے ساتھ تمہارے نام مٹ چکے اور تمہاری جان کے ساتھ تمہارے کام پورے ہوئے مگر ہاں۔ بدنامی کے چھینٹے تمہاری قبروں پر چھائے ہوئے ہیں۔ تمہارے شر و صلاح کار خود غرضی و دل آزاری ابھی زندہ ہیں اور بزمِ دُنیا میں تمہارے اوپر ٹھٹھے لگا رہے ہیں۔

ان ہی اینٹ پتھروں کے ساتھ ٹوٹی پھوٹی سلوں کے نیچے ایسی صورتیں بھی چھپی ہیں جن کی خاک کا ایک ایک ذرہ گوہرِ آب دار کی طرح چمک رہا ہے۔ کارخانۂ قدرت کے پکے اصول ان کا سلسلۂ حیات منقطع کر چکے۔ مگر ان کے مبارک نام چمنستانِ حیات میں شاداب پھولوں کی طرح لہلہا رہے ہیں۔ عالمِ امکان ان کی خوشبو سے معطر ہے۔ خلوص و صداقت کے ٹھنڈے اور میٹھے چشمے ان یادگاروں کو سینچ رہے ہیں۔

اے منزل مقصود پر پہونچ جانے والو تم دنیائے ناپائدار سے رخصت ہوئے۔ تمہارا نام صفحۂ ہستی سے مٹ چکا۔ تمہاری ہڈیاں خاک ہو چکیں۔ مگر پردیسی مسافرو تمہارا زمانہ قیام نعمت و برکت تھا۔ تمہاری زندگی ایسے گلہائے رنگین سے آراستہ تھی جو قیامت تک نہ مرجھائیں گے۔ تمہارا نام چمنستانِ قدرت میں گل خوش رنگ ہو کر کھلا اور بساطِ زندگانی میں بقائے جاودانی کی خوشبو سے ممتاز ہوا۔ تمہارے ٹوٹے پھوٹے مزارات زردوں کی خواب گاہیں جن کے آگے قمر جہاندیدہ ماند ہے۔

آج پلواری قبرستان میں بزم شہداء سجی ہوئی ہے۔ وضعداری کے ہار گلے میں پڑے ہیں سچی محبت کے طرّے سروں پر ہیں۔ ایک کشتی زرنگار خون ناحق کے خوان پوش سے ڈھکی بیچ میں رکھی ہے جس میں اخلاق و محبت کا سہرا چُنا ہے۔ بڑے بڑے وفادار بیٹھے اپنے وضعدار آغا کے لال دراج بدنصیب کی آمد کا انتظار کر رہے ہیں۔

رخصتی کا تمام سامان تیار ہو گیا۔ دراج بدنصیب بچی کو کلیجے سے لگائے بیٹھا تھا شہباز کے حکم سے ایک شقی القلب محافظ نے شبانہ کو باپ کی گود سے چھینا اور زبردستی پکڑ کر علیحدہ کرنے لگا۔ وہ نہایت ستم انگیز وقت اور دردناک سماں تھا۔ بچی باپ کو چمٹی ہوئی چیخ رہی تھی اور کہہ رہی تھی :-

"بابا! بابا! بچا میرو ی؟"

لیکن وہ سنگدل محافظ گھسیٹ کر الگ کر رہا تھا۔ آخر کار زبردستی اور سر زور و ظلم جھٹکا دے کر الگ کر دیا۔ بچی مجبور باپ معذور دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ شبانہ بلک رہی تھی اور محافظ سے منت کر رہی تھی :-

"آغا اچہ سے گئی ؟"

ایسے حسرت ناک موقعہ پر جہاں بچے اور بڈھا سب کی آنکھ سے آنسو جاری تھے دراج نے شہباز کی طرف دیکھ کر کہا :-

"وزیر اعظم! اچھے بچوں میں یہ ایک بچی بچی تھی جو آپ کے ہاتھوں آج ہمیشہ کے واسطے جدا ہوتی ہے۔"

سواری شاہین کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا شیسبانہ چیختی چلاتی رہی اور شہباز دراج کو سولی پر لے گیا۔
شہزادی نے مقتل میں داخل ہوتے ہی وزیر کو حکم دیا۔

"دراج سے پوچھو کوئی آخری درخواست ہے"

وزیر نے آگے بڑھ کر دراج کو حکم سنایا جس کے جواب میں اس نے بآواز بلند کہا:۔

"ہاں ہے! اور وہ یہ کہ اس وقت بھی شہزادی کی صورت نہ دیکھوں"

اب کیا باقی تھا۔ اسی حالت غیظ و غضب میں اجازت دی۔ اور چشم زدن میں دراج کا خاتمہ ہو گیا۔

دراج کا کام تمام ہونے کے بعد شاہین واپس جانے کو تھی۔ کہ جلاد نے حاضر ہو کر ایک پرچہ دیا۔ اور کہا:۔

"یہ مقتول کی وصیت ہے"

وہیں کھڑے کھڑے کھول کر پڑھنے لگی۔ لکھا تھا:۔

آہ! ملکہ گل اندام! دراج بدنصیب اب اس قابل نہ رہا کہ شہزادی کے پہلو میں جگہ پائے۔ دل کے ارمان دل ہی میں رہے اور تقدیر نے تمام خواہشوں کا خاتمہ کر دیا۔ شاہین! ہائے شاہین! مرض عشق نے جیتے جی مردہ بنا دیا اور اس لائق نہ رکھا کہ تیرے حکم کی تعمیل کر سکوں۔

خوبیوں بھری ملکہ! دل گوارا نہیں کرتا کہ دراج کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور شاہین کو آزار ہو۔ میری بے گناہی کا یقین کر۔ بے قصور ہوں اور دل سے مجبور! خدا اس وقت سے پہلے مجھ کو موت دے کہ میں سامنے آ کھڑا ہوں۔ اور میری ہوا تجھ تک پہونچے۔ دل تڑپ رہا ہے۔ زبان نکل رہی ہے۔ کلیجے پر چھریاں چل رہی ہیں

ارمان ہے کہ کسی طرح ایک دفعہ صورت اور دیکھ لوں۔ مگر نہیں نہیں۔ شاہین گل اقدام بہ تقاضائے محبت نہیں ہے۔

الحمد للہ دعویٰ محبت پورا ہوا اور دراج بدنصیب اپنی شہزادی پر قربان۔ ملکہ دُنیا کی خوبیاں تیرے ساتھ۔ ترقی اقبال روز افزوں۔ میرا غم نہ کیجیو۔ سچا فرمانبردار تھا جان نثار کر دی۔

شاہین یہ دُنیا فانی ہے۔ کوئی چیز قایم رہنے والی نہیں۔ میں مر چکا ہوں گا جسد خاکی گل چکا ہوگا۔ مگر چشم تامل سے دیکھنے والے پرکھ لیں گے۔ کہ دراج بدنصیب محبت کی کسوٹی پر پارس کی طرح چمکا۔ اور کندن کی طرح نکلا۔ تقدیر کی خوبی تھی۔ کہ شہباز نے دوستی کے پردے میں دشمنی کی۔ مگر از بناجیل ساز نکلا۔ بہر حال میں خوش نصیب ہوں۔ کہ ارمان پورا ہو گیا۔ اور آج دراج اپنی محبوبہ پر فدا ہوا۔

دکھیاری ماں جس نے پال پوس کر اتنا بڑا کیا۔ اور جس کی تقدیر میں جوان بیٹے کا داغ لکھا تھا۔ مامتا کی ماری مقتل میں آئے گی۔ اگر قتل کے بعد غصہ فرو ہو جائے تو یہ بیکار جسم جو اُس کی تیس اکتیس برس کی امانت ہے۔ اُس کو دے دیا جائے کہ زندہ دیکھ کر خوش ہوتی تھی۔ مردہ دیکھ کر تسکین ہو۔ اور دراج بے گناہ کی لاش پیوند زمین ہو جائے۔ آہ ملکہ! آہ شاہین۔ ہائے شہزادی اب کلیجہ اڈا چلا آتا ہے میری خطا معاف۔ میرے قصور سے درگذر۔ میری غلطی سے چشم پوشی۔ میری تابعداری کا یقین۔ میری وفاداری کا اعتبار۔ بس ملکہ فی امان اللہ! خدا تیرا نگہبان اور حافظ۔"

صرف اس نمک حلالی کے کارن دراج بدنصیب پر جو گذری تھی گذر گئی۔ وہی دراج جو کل ملکہ شاہین کے گلے کا ہار تھا آج اُس کے ہاتھوں ہمیشہ کے واسطے ختم ہو گیا اس میں کلام نہیں کہ بات کے دھنی نے وہ کام کیا۔ کہ سچی محبت

عدالت العالیہ کے نام پر آنسو بہائے اور شاہین نے شہباز اور اس کے خاندان
کو زر و جواہر سے مالا مال کر دیا۔ لیکن اتنا افسوس ضرور ہے کہ ملکہ کے دامنِ عصمت
پر اس بے گناہ کے خون کا دھبہ بہت برا لگا۔ دل کیا تھا ندر اور ہاتھ پکڑ اٹھا۔
تو لالچ دیکھتی۔ مگر عورت ذات، دل کی بوری ارادے کی کچی۔ اچھی قدر دانی کی کہ
جان ہی سے کھو یا۔ ذراج کی موت کیسی ہی عبرت ناک کیوں نہ ہو تاہم پھر بھی اس
لحاظ سے ضرور بہتر تھی کہ وہ خاک میں مل کر تمام مصیبتوں سے چھوٹ گیا۔ اس
بدنصیب کو کیا خبر تھی کہ یہ اتنی بڑی آدمی آخر وقت طوطے کی طرح دیدے بدل جائے
گی۔ کسوٹی پر رکھا تھا تو پرکھ کر دیکھتی اور ایسی بدگمان نہ ہوتی کہ جان ہی سے
کھو یا۔ تاہم ذراج کی محبوبہ تھی۔ اب بھی ہمارا دل نہیں چاہتا کہ شاہین کو برا کہیں
شہزادی تھی تو ہو۔ ناقص العقل تھی۔ اعتبار نہ کیا اور بغلی گھونسے کا اوچھا چلنے
دیا۔ محبت کا تقاضا تھی شہزادی سے ملنے کا ارمان جی میں لے گیا۔ دعا ہے کہ خدا اس
کی حالت پر رحم کرے اور امید کے ساتھ یقین ہے کہ منصفِ حقیقی اس کی
آرزو پوری کرے گا اور حوروں کے بدلے شاہین اس کی مطلوبہ اس کی ملکیت ہوگی۔
بکرے کی ماں کب تک خیر منائے جب تک شاہین کی آنکھوں پر غفلت کا
پردہ پڑا رہا شہباز عیشوں پر جھکے دیتا رہا اور داؤں کرتا رہا مگر جلاد کا بچہ
لا کر دیتا تھا چور کی ڈاڑھی میں تنکا۔ شہباز کا خون خشک ہوگیا۔ لاش کو جا کر
دیکھا انگوٹھی ہاتھ میں رومال جیب میں۔ وزیر کو ساتھ لے کر ذراج کے گھر آئی۔
مرض کی مفصل کیفیت دریافت کی طبیب کو بلایا تو معلوم ہوا وہ بھی شہباز
کی عیاری تھی سچی جھوٹی اڑا دی چلائی۔ مگر اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ
گئیں کھیت۔ نہایت احترام وزیر کو گرفتار کیا اور اسی مقتل میں سولی دے کر اس
کے ٹکڑے کر کے اور چیلوں کے حوالے کئے۔

آغا قندھاری اور شعبانہ دونوں دادی پوتیوں کو اشرفیوں سے تول دیا اور ایک ہزار روپیہ ماہوار کا وظیفہ دائمی خاندان کے واسطے مقرر کر دیا۔ دراج کو غسل دیا اور برہنہ سر قبرستان لے چلی شعبانہ آغا قندھاری دونوں ساتھ تھے۔ اور ہزاروں آدمیوں کا ہجوم تھا۔ اس مجمع میں علی الاعلان دراج کی وفاداری اور نمک حلالی پر خون کے آنسوؤں سے روئی۔ اور مغرب کے قریب اس محبت کے بندے کو ہمیشہ کے واسطے زمین کے سپرد کر دیا۔

راشد الخیری مرحوم کی دیگر کتب

صبح زندگی	2/-
شام زندگی	1/8/-
شب زندگی (کامل)	2/8/-
ماہ عجم	2/-
آفتاب دمشق	2/-
درشہوار	-/12/-
جوہر قدامت	2/4/-
سنجوگ	-/12/-
طوفان حیات	1/12/-
ستونتی	-/12/-